مطالعۂ سیرت
سیرت رسول کا علمی اور تاریخی مطالعہ
مولانا وحید الدّین خاں

مطالعۂ سیرت

سیرت رسول کا علمی اور تاریخی مطالعہ

مولانا وحید الدّین خاں

فہرست

آغاز کلام

سیرت نگاری کے دو طریقے ہیں۔ مقلدانہ اور مجتہدانہ۔ سیکڑوں سال سے سیرت نگاری کا جو اسلوب ہمارے یہاں چلا آرہا ہے وہ زیادہ تر مقلدانہ اسلوب ہے۔ اس کے مقابلہ میں مجتہدانہ اسلوب وہ ہے جو عصر حاضر کے اسلوب کے مطابق ہو۔ یعنی وہ اسلوب جو آج کے انسان کے لئے پیغمبر اسلام کے نمونہ کو قابل فہم بنائے، جو آج کے انسان کو اپنے زمانہ کی چیز دکھائی دینے لگے۔

جہاں تک میرا علم ہے، پریس کا دور آنے کے بعد مختلف زبانوں میں سیرت پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ تقریباً سب کی سب مقلدانہ اسلوب میں لکھی گئی ہیں۔ اگر بظاہر کوئی کتاب قدیم اسلوب سے ہٹی ہوئی نظر آتی ہے تو یہ فرق بھی محض ظاہری ہے۔ اصل حقیقت کے اعتبار سے یہ کتابیں بھی مقلدانہ ہی ہیں۔ اگرچہ ظاہر پسند لوگ اپنی خوش فہمی کی بنا پر ان کو مجتہدانہ سمجھ لیتے ہیں۔

مقلدانہ اسلوب کیا ہے، اس کو بتانے کے لئے کسی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ آپ سیرت کے موضوع پر لکھی ہوئی کسی بھی کتاب کو دیکھئے وہ آپ کے لئے مقلدانہ اسلوب کا ایک تعارف ہوگی۔

مجتہدانہ اسلوب سے مراد یہ ہے کہ سیرت نبوی کو از سر نو جدید اصطلاحوں میں سمجھنے کی کوشش کی جائے۔ آج کا انسان جن اصطلاحوں میں سوچتا ہے، ان اصطلاحوں میں از سر نو سیرت نبوی کی تبیین و توضیح کی جائے۔

قدیم زمانہ میں سیرت کے عنوان سے جو کتابیں لکھی گئیں۔ مثلاً سیرت ابن ہشام،

ان میں اضافہ کی یقینی ضرورت ہے۔ مگر اضافہ اس قسم کا نہیں جو بعد کے دور میں کیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ سیرت کی ابتدائی کتابوں میں سیرت کے کچھ اجزاٗ آئے ہیں، اس کے بہت سے اجزاٗ ان کتابوں میں شامل نہیں ہو سکے۔ یہ اجزاٗ اب بھی حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں۔ وہ اجزاٗ مختلف عنوانات کے تحت حدیث کی کتابوں میں بکھرے ہوئے ملتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ حدیث کی کتابوں کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کر کے سیرت کے اجزاٗ کو ان سے نکالا جائے اور ان کو سیرت کی کتابوں میں شامل کیا جائے۔ مگر یہ کام انجام نہ پاسکا۔ سیرت کے یہ قیمتی اجزاٗ ہم حدیث کی کتابوں میں متفرق طور پر دیکھتے ہیں۔ مگر سیرت کے عنوان کے تحت وہ ہمارے سامنے نہیں آتے۔ اس لئے عام قاری ان اجزاٗ کو اسوۂ نبوی کے طور پر اخذ نہیں کرپاتا۔ قاری کے اوپر ان کا وہ تاثر نہیں ہو تا جو کہ بطور واقعہ ہونا چاہئے۔

دور اول میں سیرت کی کتابیں صرف سیرت نبوی پر مشتمل ہوتی تھیں۔ مثلاً ابن اسحاق کی سیرت جو اب سیرت ابن ہشام کی شکل میں اسلامی کتب خانہ میں موجود ہے۔ بعد کے سیرت نگاروں نے اس میں توسیع کی۔ وہ سیرت کے موضوع میں بہت سی دوسری چیزیں شامل کرنے لگے۔ مثلاً ابن قیم کی کتاب زاد المعاد میں فقہی مسائل، حسین ہیکل کی کتاب حیاۃ محمد میں مستشرقین کے جوابات، وغیرہ۔ اس رجحان کو مولانا سید سلیمان ندوی نے آخری حد پر پہنچادیا جب کہ انھوں نے سیرت کو اسلام کا انسائیکلوپیڈیا بنانے کی کوشش کی۔

اس قسم کی توسیع مصنف کے علمی کمال کا اظہار ہو سکتی ہے مگر وہ سیرت کے مطالعہ کا کوئی مطلوب طریقہ نہیں۔ سیرت نبوی کا اصل مقصد، قرآن کے مطابق "اسوہ نبوی" کو

جاننا ہے (الاحزاب ۲۱) مگر مذکورہ قسم کی کتابوں میں یہ پہلو اتنا دب جاتا ہے کہ قاری ان سے سیرت کی اصل غذا نہیں لے پاتا۔

زیر نظر کتاب میں سیرت کا مطالعہ اسی خاص پہلو سے کیا گیا ہے۔ تاہم یہ موضوع کا مکمل مطالعہ نہیں۔ زیر نظر کتاب کی حیثیت اصلاً اس موضوع کے تعارف کی ہے نہ کہ اس موضوع کے جامع بیان کی۔

وحیدالدین

۲۱ اکتوبر ۱۹۹۸

مطالعہ سیرت

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت پر مختلف زبانوں میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔ مگر مسلم اہل علم کی لکھی ہوئی ان کتابوں میں عمومی طور پر ایک مشترک کمی پائی جاتی ہے وہ یہ کہ یہ کتابیں زیادہ تر تقدس کے جذبہ کے تحت لکھی گئی ہیں۔ یہ طریقہ عقید تمندانہ مطالعہ کے اعتبار سے اہم ہو سکتا ہے۔ مگر علمی اعتبار سے اس طرز پر لکھی ہوئی کتابوں کی اہمیت زیادہ نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مستشرقین کی لکھی ہوئی اکثر کتابوں کی علمی قدر و قیمت مسلمانوں کی لکھی ہوئی کتابوں سے زیادہ ہوتی ہے۔ مستشرقین اپنے موضوعی (objective) مطالعہ کی بنا پر اکثر وہ قیمتی نکتہ دریافت کر لیتے ہیں جس کو ہمارے سیرت نگار دریافت کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔

مثال کے طور پر۔ ای۔ ای۔ کلیٹ (E E Kellet) ایک برطانی مستشرق ہے اس نے اپنی ایک کتاب میں پیغمبر اسلام کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ ----- پیغمبر اسلام نے دشواریوں کا مقابلہ اس عزم کے ساتھ کیا کہ وہ ناکامی سے کامیابی کو نچوڑیں۔

He faced adversity with the determination to wring success out of failure

موجودہ زمانہ میں پیغمبر اسلام پر بے شمار نعتیہ قصائد لکھے گئے ہیں اور بے شمار مدحیہ کتابیں تصنیف کی گئی ہیں۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مغربی مستشرق کا مذکورہ جملہ مسلم شعراء اور مصنفین کی لکھی ہوئی تمام منظوم اور منثور نعتوں پر بھاری ہے۔ مذکورہ جملہ قاری کے لئے ایک نشان راہ کی حیثیت رکھتا ہے جبکہ مسلمانوں کی لکھی ہوئی مدحیہ تحریروں میں قاری کو صرف فخر یا تقدس کی غذا ملتی ہے۔ ان کے ذریعہ قاری کو وہ رہنمائی نہیں ملتی جس کو قرآن میں اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے (الاحزاب ۲۱)

اس موضوع پر ایک مشہور مصنف کی کتاب السیرۃ النبویۃ کے نام سے چھپی ہے۔ اس کے مقدمہ میں صاحب کتاب لکھتے ہیں کہ ـــــ مولف کو معلوم تھا کہ سیرت کے موضوع پر لکھنے والوں نے بہت سی اہم کتابیں لکھی ہیں۔ مگر مؤلف نے اس کو اپنی سعادت سمجھا کہ وہ سیرت کے عظیم موضوع پر ایک نئی کتاب لکھے اور اس طرح وہ سیرت نگاروں کی اس نورانی لڑی میں شامل ہو جائے:

وکان یری السعادۃ فی تالیف کتاب حدید فی السیرۃ النبویۃ لینخرط فی سلك المؤلفین النورانی فی هذاالموضوع الحبیب الحلیل۔(،صفحہ ۱۰)

ظاہر ہے کہ یہ مطالعہ کا کوئی علمی طریقہ نہیں۔ اس طرز مطالعہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیرت کا موضوع مسلمانوں کے درمیان علمی وفکری ارتقاء کا ذریعہ نہ بن سکا۔ وہ صرف عقیدت مندانہ جذبات کی تسکین یا فخر ومباہات کے اظہار کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔

موجودہ زمانہ میں سیرت کے موضوع پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں وہ زیادہ تر اسی نوعیت کی ہیں۔ وہ مسلمانوں کے لئے کتاب فخر تو ضرور ہیں، مگر وہ حقیقی معنوں میں ان کے لئے کتاب اسوہ یا کتاب رہنمائی نہیں۔

چند مثالیں

ہمارے سیرت نگار جب سیرت کے موضوع پر لکھتے ہیں تو وہ اکثر ایسا کرتے ہیں کہ بعثت سے قبل عرب کی حالت کی نہایت تاریک تصویر پیش کرتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ بعثت سے قبل سارا عرب تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اخلاقی اعتبار سے لوگ وحشی بنے ہوئے تھے۔ درجنوں عورتوں سے نکاح کر کے ان کو اپنے گھر میں رکھ لیا کرتے تھے۔ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی مار ڈالتے تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی باتیں پیغمبر اسلام ﷺ کے کارنامے کو نمایاں کرنے کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ جب تک عربوں کو آخری حد تک برا ثابت نہ کیا جائے، پیغمبر اسلام کی عظمت ظاہر نہیں ہو سکتی۔ مگر یہ نہ صرف تاریخ کے خلاف ہے بلکہ خود قرآن وحدیث کے خلاف بھی۔

اس طرح کی باتوں کا نقصان یہ ہے کہ مسلمانوں میں علمی نقطۂ نظر پیدا نہ ہو سکا۔ مسلمان حقیقت پسند قوم بننے کے بجائے پر اسرار خیالات میں جینے والی ایک قوم بن گئے۔ کسی بھی حقیقت کو علمی اور تاریخی حیثیت سے سمجھنا ان کے لئے ممکن نہ رہا۔ ان کے اکابر تک کا یہ حال ہے کہ وہ صرف پر اسرار اصطلاحوں میں سوچنا جانتے ہیں۔ سائنٹفک اصطلاحوں میں سوچنا ان کے لئے ممکن ہی نہیں۔

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالی نے پیغمبر اسلام کو بہترین لوگوں میں پیدا کیا (الانعام ۱۲۴) اس کی مزید تفصیل روایات میں آئی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: اللہ نے انسانوں کو پیدا کیا پھر مجھ کو بہترین انسانوں میں اٹھایا (ان الله خلق الخلق فجعلنی فی خير خلقه) تفسیر ابن کثیر ۱۷۳/۲

اس سے واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جن عربوں کے اندر مبعوث کئے گئے وہ اخلاق و کردار کے اعتبار سے پوری دنیا میں سب سے بہتر لوگ تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسی لئے یہ ممکن ہوا کہ آپ ایک ایسا انقلاب لائیں جس کی نظیر تاریخ میں موجود نہیں۔ اگر عرب کے یہ لوگ ویسے ہی برے ہوتے جیسا کہ ہماری کتابوں میں بتایا جاتا ہے تو اصحاب رسول کی وہ اعلیٰ ٹیم ہی نہ بنتی جس کو قرآن میں خیر امت کہا گیا ہے (آل عمران ۱۱۰) اور جس کی وجہ سے دین توحید کی عظیم تاریخ وجود میں آئی۔ یہی وہ حقیقت

ہے جس کی طرف حدیث کے ان الفاظ میں اشارہ کیا گیا ہے : خیارکم فی الجاھلیة خیارکم فی الا سلام اذافقھوا (فتح الباری ٤٧٧/٦)

مطالعۂ سیرت کے مذکورہ اسلوب نے پورے معاملے کو غیر علمی بنادیا۔ مثلاً ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ بعثت سے پہلے عرب کے لوگ درجنوں کی تعداد میں بیویاں رکھتے تھے۔ دوسری طرف انھیں کتابوں میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ عرب اپنی لڑکیوں کو پیدا ہونے کے بعد مار ڈالتے تھے۔ اب سوال یہ ہے کہ جس سماج میں لڑکیاں زندہ درگور کی جارہی ہوں وہاں عورتیں اتنی زیادہ تعداد میں کیسے پائی جائیں گی کہ لوگوں کو یہ موقع ملے کہ وہ لامحدود تعداد میں اپنے گھروں میں عورتیں رکھ لیں۔

اصل یہ ہے کہ زیادہ تعداد میں نکاح کرنے کا رواج صرف کچھ سرداروں میں تھا نہ کہ عام عربوں میں۔ اور یہ سردار بھی یہ عمل اس لئے کرتے تھے کہ مختلف قبائل سے رشتہ داریاں قائم کر کے انہیں اپنی سرداری کے تحت متحد کر سکیں۔ اسی رواج کو پیغمبر اسلام ﷺ نے بھی اسلام کے حق میں استعمال کیا۔ آپ نے بھی مختلف قبائل کی خواتین کو اپنے نکاح میں لیا تاکہ ان قبائل کو جنگ کے بغیر اسلام کا حامی بنا سکیں۔

جہاں تک لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کا معاملہ ہے تو وہ صرف استثنائی طور پر بعض غریب قبائل میں تھا۔ عام عرب اس کو سخت معیوب سمجھتے تھے۔ حتی کہ وہ غریب خاندانوں کی مالی مدد کرتے تھے تاکہ وہ اس وحشیانہ رسم سے باز رہیں۔

اس سلسلہ کی ایک عام غلطی یہ ہے کہ بطور خود پیشگی طور پر یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ سب سے بڑا کارنامہ "باطل" سے ٹکرانا ہے۔ اس لئے پیغمبر کی وہی تصویر اعلیٰ تصویر ہے جس میں وہ لوگوں کے ساتھ برسرجنگ نظر آئے۔

اس مفروضہ کی بنا پر ہمارے سیرت نگار ہمیشہ پیغمبر اسلام کو ایک لڑنے والے پیغمبر کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔ حتی کہ سیرت کی کتابوں کے لئے اکثر مغازی کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً مغازی ابن اسحٰق وغیرہ۔

مگر اصل حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ پیغمبر اسلام کی حقیقی سیرت جنگ وجدال کی مثال نہیں ہے۔ بلکہ امن پسندی اور صبر واعراض کی مثال ہے۔ پیغمبر اسلام کا مقصد لوگوں سے لڑنا یا ان کو ہلاک کرنا نہیں تھا بلکہ انہیں زندگی دینا تھا۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔

یاایها الذین امنوا استجیبوالله وللرسول اذا دعا کم لما یحییکم ۔(الانفال ٢٤) اے ایمان والو اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہو جبکہ رسول تم کو اس چیز کی طرف بلا رہا ہے جو تم کو زندگی دینے والی ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کے ذریعہ جو دین لوگوں کے پاس بھیجا گیا ہے وہ مردہ دلوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ یہ پیغام اپنے اندر حیات بخشی کی صفت رکھتا ہے۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے۔

اومن کان میتا فاحیینه وجعلنا له نوراً یمشی به فی الناس کمن مثله فی الظلمات لیس بخارج منها

کیا وہ شخص جو مردہ تھا پھر ہم نے اس کو زندگی دی اور ہم نے اس کو ایک روشنی دی کہ اس کے ساتھ وہ چلتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جو تاریکیوں میں پڑا ہے، وہ اس سے نکلنے والا نہیں۔

یہ اور اس طرح کی دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر کا مشن بادشاہوں

کے مشن سے مختلف ہے۔ ایک بادشاہ کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو مغلوب کر کے ان کے اوپر اپنی حکومت قائم کرے۔ اس لئے بادشاہ ہمیشہ "جنگ و تشدد" کا طریقہ اختیار کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔

لیکن پیغمبر کا مقصد لوگوں کے اوپر حاکم بننا نہیں تھا بلکہ لوگوں کے دل و دماغ کو بدلنا تھا۔ تاکہ وہ اعلیٰ روحانی زندگی گذاریں اور دنیا اور آخرت کی سعادت کے مستحق ہوں۔

پیغمبر لوگوں کو اپنے حریف یا دشمن کے طور پر نہیں دیکھتا۔ بلکہ وہ ان کو صرف انسان کے طور پر دیکھتا ہے۔ وہ ہر انسان کا ہمدرد ہوتا ہے۔ اس کے دل میں تمام لوگوں کے لئے خیر خواہی کا جذبہ ہوتا ہے۔ وہ لوگوں کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ایک ماں اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔ پیغمبر کی خاص صفت شفقت علی الخلق ہے، حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ لوگ اس کے اوپر زیادتیاں کر رہے ہوں، لوگ اس کو نقصان پہنچانے کے درپے ہوں۔

پیغمبر آدمی کے اندر چھپی ہوئی فطرت کو جگانا چاہتا ہے۔ وہ ہر آدمی کے سینہ میں ربانیت کا باغ اگانا چاہتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ ہر شخص فکر و عمل کے اعتبار سے ایک صالح انسان بن جائے۔

اس قسم کا مقصد کبھی جنگ اور ٹکراؤ سے حاصل نہیں ہوتا۔ وہ اس طرح حاصل ہوتا ہے کہ لوگ بگڑے ہوئے ہوں تب بھی ان کے ساتھ یک طرفہ طور پر محبت کا معاملہ کیا جائے۔ لوگوں کے حال کو نظر انداز کرتے ہوئے ان کو ان کے مستقبل کے اعتبار سے دیکھا جائے۔ اس قسم کی مثبت روش پر قائم رہنا صبر و اعراض کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی لئے قرآن میں پیغمبر کو بار بار صبر اور اعرض کی تلقین کی گئی ہے۔

اسی کی ایک انتہائی صورت وہ ہے جس کو قرآن میں تالیف قلب (التوبہ ٦٠) کہا گیا

ہے۔ یعنی اپنے مزاج کو پس پشت ڈال کر دوسروں کے مزاج کی رعایت کرنا۔ پیغمبر اسلام نے اپنے مدعو لوگوں کے ساتھ ہر مرحلہ میں تالیف قلب کا یہی طریقہ اختیار کیا۔ اس معاملہ میں آپ یہاں تک گئے کہ مدینہ میں داخلے کے بعد آپ نے تقریباً ڈیڑھ سال تک یہود کے قبلہ کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔ یہ یہودِ مدینہ کی تالیف قلب کے لئے تھا، وہ اس امید میں تھا کہ وہاں کے یہودی آپ سے قریب ہوں، وہ آپ کی باتوں کو کسی توحش کے بغیر سنیں۔ (الجامع لاحکام القرآن للقرطبی) ۲/۱۵۰

مسلم مصنفین کے یہاں سیرت کے مطالعہ کا مقبول رجحان یہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کو کامل نمونہ قرار دیتے ہیں اور اسوہ کاملہ کے عنوان کے تحت آپ کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں یہ اسلوب نہ صرف غیر علمی ہے بلکہ وہ غیر قرآنی بھی۔

اسوۂ کاملہ کو اگر پیغمبر اسلام کی سیرت کے مطالعہ کا عنوان قرار دیا جائے تو پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تصور کا ماخذ کیا ہے۔ اس معاملہ میں علمی طریقہ یہ ہے کہ سب سے پہلے قرآن وحدیث سے یہ ثابت کیا جائے کہ آپ کے اسوہ کی حیثیت اسوہ کاملہ کی تھی، یعنی کامل نمونہ۔ اگر قرآن وحدیث سے یہ تصور ثابت نہ ہو تو یہ ساری بحث ابتدائی طور پر ہی بے بنیاد قرار پائے گی۔ مگر عجیب بات ہے کہ جن سیرت نگاروں نے اسوہ کاملہ کو عنوان قرار دے کر آپ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ ان میں سے غالباً کسی نے بھی اس ابتدائی علمی شرط کو پورا نہیں کیا۔

علمی نقطۂ نظر سے صحیح بات یہ ہے کہ قرآن میں پیغمبر اسلام ﷺ کو اسوۂ حسنہ کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ نہ کہ اسوۂ کاملہ کے طور پر۔ اسوۂ کاملہ کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ہر ایک معاملہ کے لئے خواہ وہ کسی بھی زمانہ میں پیش آئے، آپ کی ذات میں اس کا براہ

راست عملی نمونہ موجود ہے۔ مگر بطور واقعہ ایسی کاملیت ممکن ہی نہیں۔ مثال کے طور پر ایک آدمی رسول اللہ کے یہاں بیٹی کی تربیت کا نمونہ تو پا سکتا ہے۔ مگر بیٹے کی تربیت کا نمونہ رسول اللہ کے یہاں اس کو نہیں ملے گا۔ رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا نمونہ تو آپ کے یہاں ملے گا، مگر والدین کے ساتھ حسن سلوک کا نمونہ آپ کے یہاں موجود نہیں۔ اس معاملہ میں زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی حیثیت اسوۂ حسنہ کی ہے نہ کہ اسوہ کاملہ کی۔ یہی تصور قرآن سے ثابت ہے اور یہی علمی طور پر درست ہے۔

ایک غلطی جو بیشتر سیرت نگاروں کے یہاں پائی جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ انہوں نے پیغمبر کو داعی کے بجائے حاکم سمجھ لیا۔ اس غلط فہمی کا عکس سیرت کی اکثر کتابوں میں پایا جاتا ہے۔ سیرت کی معروف کتابیں پیغمبر کو داعی اور ناصح کے روپ میں پیش نہیں کرتیں بلکہ وہ اس کو حاکم اور فاتح کے روپ میں پیش کرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کتابوں میں پیغمبر کی اصل شخصیت نمایاں نہیں ہوتی۔

علمی مطالعہ کے بجائے عقیدت مندانہ مطالعہ سے یہ نقصان ہوا کہ ہمارے سیرت نگار بہت سی ایسی حقیقتوں کو دریافت نہ کر سکے جو قرآن میں صراحۃً مذکور تھیں۔ انہیں میں سے ایک معجزہ کا مسئلہ ہے۔ ہمارے سیرت نگار عام طور پر کثرت سے پیغمبر اسلام کے معجزات کا ذکر کرتے ہیں۔ مگر یہ پورا تصور قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن میں واضح طور پر بتا یا گیا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو اس قسم کے معجزے نہیں دیے گئے جو پچھلے پیغمبروں کو دیئے گئے تھے۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے آپ کے مخاطبین یہ مطالبہ کرتے تھے کہ اگر تم پیغمبر ہو تو دوسرے نبیوں جیسا حسی معجزہ ہمیں دکھاؤ۔ پیغمبر اسلام ﷺ لوگوں کی ہدایت کی امید میں

یہ چاہنے لگے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسا کوئی معجزہ ظاہر کیا جائے۔ مگر قرآن میں آپ کی اس خواہش کو رد کرتے ہوئے یہ فرمایا گیا: "اور اگر ان کی بے رخی تم پر گراں گزر رہی ہے تو اگر تم ایسا کر سکتے ہو تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈھو یا آسمان میں سیڑھی لگاؤ اور ان کے لئے کوئی نشانی (معجزہ) لے آؤ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو ان سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا۔ پس تم نادانوں میں سے نہ بنو (الانعام ۳۵)

دوسری جگہ قرآن میں اس مستقل پالیسی کا اعلان کیا گیا ہے کہ پچھلے پیغمبروں کے برعکس، پیغمبر آخرالزماں کو حسی معجزے نہیں دیئے جائیں گے۔ قرآن کی درج ذیل آیت اس کے حق میں ایک قطعی ثبوت ہے:

ومامنعنا ان نرسل با لایات الا ان کذب بها الا ولون واتینا ثمود الناقة مبصرة فظلموا بها وما نرسل بالایات الا تخویفا۔(بنی اسرائیل ۵۹)اور ہم کو نشانیاں (معجزے) بھیجنے سے نہیں روکا مگر اس چیز نے کہ اگلوں نے ان کو جھٹلایا۔ اور ہم نے ثمود کو اونٹنی دی ان کو سمجھانے کے لئے۔ پھر انھوں نے اس پر ظلم کیا۔ اور نشانیاں ہم صرف ڈرانے کے لئے بھیجتے ہیں۔

یہ غیر علمی مطالعہ کی ایک واضح مثال ہے۔ ہمارے سیرت نگاروں کو محسوس ہوا کہ اگر وہ یہ مان لیں کہ پیغمبر اسلام کو حسی معجزے نہیں دئے گئے تو وہ پچھلے انبیاء کے مقابلہ میں کچھ کم ہو جائیں گے۔ اس لئے غیر واقعی طور پر انہوں نے آپ کی ذات کے ساتھ بہت سے معجزے وابستہ کر دیئے۔ حالانکہ قرآن میں صراحۃً اس کی تردید موجود تھی۔

خود حدیث میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ آپ کو اس قسم کے معجزے نہیں دئے گئے۔ جس طرح کے معجزے پچھلے نبیوں کو دئے گئے تھے۔ اس سلسلہ میں صحیح بخاری

کی یہ حدیث قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ نبیوں میں سے ہر نبی کو ایسی نشانی دی گئی جس کو اس زمانہ کے لوگ مانتے تھے۔اور مجھ کو وحی (قرآن) کا معجزہ دیا گیا۔اس لئے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت میں مجھ پر ایمان لانے والوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی۔

ما من الانبیاء نبی الا اعطی من الایات ما مثله امن علیه البشر وانما کان الذی اوتیته وحیا اوحاه الله الی فارجو ان اکون اکثرهم تابعا یوم القیامة۔(فتح الباری ٦١٩/٨)

اصل یہ ہے کہ جن واقعات کو پیغمبر اسلام کے معجزات کے طور پر بیان کیا جاتا ہے۔ وہ سب نصرت کے واقعات ہیں جو ہر مؤمن کے ساتھ پیش آتے ہیں۔اور وہ پیغمبر اسلام کو زیادہ اعلیٰ اور افضل صورت میں دیئے گئے۔ معجزہ ایک ایسے خارق عادت واقعہ کا نام ہے جو مخاطبین کے مطالبہ پر پیش کیا گیا ہو۔ مثلاً عصاء موسیٰ کا معجزہ۔ مگر اس نوعیت کا کوئی معجزاتی واقعہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں ثابت نہیں۔

شق قمر کا واقعہ بھی کوئی مطالباتی معجزہ نہیں۔بلکہ وہ ایک فلکیاتی نشانی کی حیثیت رکھتا ہے۔ہمیشہ ایسا ہوتا ہے کہ فطرت کی دنیا میں بعض انوکھے واقعات پیش آتے ہیں۔ جن کو حق کا داعی اپنے پیغام کی صداقت کے ثبوت میں پیش کرتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے شق قمر کے فلکیاتی واقعہ کو اسی طرح ایک فلکیاتی نشانی کے طور پر پیش فرمایا۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ایسا نہیں ہوا کہ منکرین نے آپ سے مطالبہ کیا اور ان کے مطالبہ کے بعد آپ نے ان کے سامنے چاند کو دو ٹکڑے کرکے کہا کہ یہ دیکھو میرا معجزہ۔اس کے برعکس روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے

کچھ اصحاب کے ساتھ مکہ میں تھے (نہ کہ مشرکین کے ساتھ) اس وقت یہ واقعہ ہوا کہ یہ دکھائی دیا کہ چاند دو ٹکڑے ہو گیا ہے۔ اس کو دیکھ کر آپ نے اپنے اصحاب سے فرمایا کہ اس کو دیکھو یہ ایک خدائی نشانی ہے (تفسیر ابن کثیر ۴/ ۲۶۲۔ ۲۶۳)

یہ ایسا ہی تھا جیسے موجودہ زمانہ میں ریڈیو سیٹ کھولا جائے اور اس سے آوازیں نکلنے لگیں تو ایک شخص لوگوں سے کہے کہ دیکھو اس مثال سے تم سمجھ سکتے ہو کہ زمین کس طرح قیامت میں خبریں سنائے گی جس کا ذکر قرآن میں کیا گیا ہے (یو منذ تحدث اخبارها)

سیرت کے مطالعہ کے اس اسلوب کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ پیغمبر کی متواضع تصویر لوگوں کو کمتر نظر آئی۔ اس لئے انہوں نے پیغمبر کی ایسی تصویر بنا ڈالی جس میں ان کے اپنے خیال کے مطابق پیغمبر اونچا دکھائی دے۔ یہی وجہ ہے کہ سیرت کی موجودہ کتابوں کو پڑھ کر آپ کی جو تصویر بنتی ہے وہ یہ ہے کہ آپ ایک جنگجو انسان تھے نہ کہ صلح جو انسان، آپ کا بھروسہ تلوار کی طاقت پر تھا نہ کہ امن کی طاقت پر، آپ دشمنوں کو کچلنے میں یقین رکھتے تھے نہ کہ ان کو دوست بنانے میں، آپ ہر وقت باطل سے ٹکرانے کے لئے تیار رہتے تھے، باطل سے سمجھوتا کرنا آپ کے مزاج کے خلاف تھا، آپ کی پالیسی ہمیشہ اقدام کی ہوتی تھی نہ کہ صبر کی، آپ کا طریقہ ناحق کو مٹانے کا تھا نہ کہ اس سے سمجھوتا کرنے کا، وغیرہ۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی یہ تصویر سراسر فرضی ہے۔ آپ کی زندگی کے گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ آخری حد تک ایک امن پسند انسان تھے۔ آپ ہمیشہ حکمت و تدبیر کے تحت عمل کرتے تھے نہ کہ جنگ و تصادم کے تحت۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کو سمجھنے میں ایک رکاوٹ سنت کا محدود مفہوم بھی ہے۔ ہمارے یہاں بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ آپ کی سنتیں کیا کیا

ہیں۔ جن چیزوں کو ان کتابوں میں بطور سنت درج کیا گیا ہے ان کو لوگ سنت سمجھتے ہیں جب کہ ان کے علاوہ اور بہت سی چیزیں ہیں جن کو ہماری کتابوں میں بطور سنت درج نہیں کیا گیا حالانکہ وہ آپ کی اہم ترین سنت کی حیثیت رکھتی ہیں۔

مثلاً بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو میں سے ایک کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ آسان کا انتخاب فرماتے (ما خیر رسول اللہ ﷺ بین امرین الا اختار ایسرھما)

اس سے معلوم ہوا کہ اختیار اعسر ایک غیر مسنون فعل ہے، اور اس کے مقابلہ میں اختیار ایسر ایک مسنون فعل۔ مگر کسی بھی کتاب میں آپ کے اس طریقہ کو بطور سنت درج نہیں کیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان عام طور پر اختیار ایسر کو چھوڑ کر اختیار اعسر کا طریقہ اپنا رہے ہیں اور اس طرح غیر مسنون فعل کو عین اسلام سمجھے ہوئے ہیں، صرف اس لئے کہ اس روش کا اندراج ہماری کتابوں میں بطور سنت موجود نہیں۔

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی ایک اہم سنت یہ تھی کہ آپ ہمیشہ یہ کرتے تھے کہ بالفعل جو صورت حال موجود ہو اس کو چھیڑے بغیر اپنے لئے عمل کا راستہ نکالتے تھے۔ مثلاً مکی دور میں کعبہ میں بتوں کی موجودگی سے تعرض کئے بغیر لوگوں کو توحید کی دعوت دینا وغیرہ۔ آپ کی اس سنت کو قرآن میں صبر کہا گیا ہے۔ آج کل کی زبان میں اس کو اسٹیٹس کو ازم کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ سنت سنن رسول کی کتابوں میں درج نہیں، نہ اسٹیٹس کو ازم کے نام پر اور نہ کسی دوسرے نام پر۔

یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں میں عام طور پر یہ مزاج بن گیا ہے کہ جب وہ بظاہر کسی خلاف حق بات کو دیکھتے ہیں تو فوراً وہ اس سے لڑ جاتے ہیں اور اس کو بطور خود اسلامی جرأت

کا نام دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ نہ اسلامی جرأت ہے اور نہ سنت رسول کی پیروی۔ وہ صرف ایک غیر حکیمانہ جوش ہے۔ اور غیر حکیمانہ جوش کا کوئی نتیجہ نہ موجودہ دنیا میں نکلنے والا ہے اور نہ بعد کو آنے والی دنیا میں۔

یہ دنیا فطرت کے اٹل قوانین پر چل رہی ہے۔ پیغمبر نے جو کچھ کیا وہ فطرت کے ان قوانین کی پیروی کرتے ہوئے کیا۔ آپ نے بلاشبہ اپنی زندگی میں عظیم کامیابی حاصل کی مگر یہ کامیابی آپ کو جوش وخروش یا غیر ضروری ٹکراؤ کے ذریعہ حاصل نہیں ہوئی۔ بلکہ قوانین فطرت کی کامل مطابقت کے ذریعہ حاصل ہوئی۔ بعد کے آنے والے مسلمانوں کے لئے بھی آپ کی یہ سنت ایک ابدی نمونہ ہے۔ اس کے سوا کوئی بھی دوسرا طریقہ اس دنیا میں قابل عمل نہیں۔ مگر موجودہ زمانہ کے مسلمان اس عظیم سنت نبوی کو جاننے سے محروم ہو گئے۔ اور اس کی سادہ وجہ یہ تھی کہ اس کو ہماری کتابوں میں سنت کے طور پر ذکر ہی نہیں کیا گیا۔

موجودہ زمانہ کے سیرت نگاروں کا عام طریقہ یہ ہے کہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کا تقابل دوسرے پیغمبروں سے کرتے ہیں اور اپنے پیغمبر کو افضل اور دوسروں کے پیغمبر کو غیر افضل ثابت کرتے ہیں۔ مطالعہ کا یہ طریقہ حدیث میں صریح طور پر منع کیا گیا ہے۔ اس ممنوع چراگاہ میں داخل ہونے کا یہ نتیجہ ہے کہ ہمارے سیرت نگار بھیانک قسم کی علمی غلطیاں کرتے ہیں اور اس طرح امت میں غیر علمی طرز فکر کو فروغ دینے کا سبب بنتے ہیں۔

مثلاً عام طور پر پیغمبر اسلام اور حضرت مسیح کا تقابل کرتے ہوئے یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت مسیح کے یہاں نرمی ہی نرمی تھی اور پیغمبر اسلام کے یہاں نرمی اور سختی دونوں۔ اس طرح یہ تصور دیا جاتا ہے کہ حضرت مسیح ایک ناقص پیغمبر تھے اور پیغمبر اسلام ایک کامل

پیغمبر۔ مگر اس قسم کی بات سراسر بے بنیاد ہے۔

حضرت مسیح کے پیغام اور کردار کو جاننے کا پہلا ماخذ، علمی اعتبار سے، انجیل ہے۔ جب اس نقطۂ نظر سے انجیل کا مطالعہ کیا جائے تو وہ صریح طور پر اس کی تردید کرتی ہے۔ مثلاً انجیل کی روایت کے مطابق، حضرت مسیح نے فرمایا:

یہ نہ سمجھو کہ میں زمین پر صلح کرانے آیا ہوں۔ صلح کرانے نہیں بلکہ تلوار چلوانے آیا ہوں (متی ۱۰: ۳۴۔۳۵)

قرآن سے بھی مذکورہ نقطۂ نظر کی تردید ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن کی سورہ الصف کی آخری آیت کا مطالعہ کیجئے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے: اے ایمان والو، تم اللہ کے مددگار بنو، جیسا کہ عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہا، کون اللہ کے واسطے میرا مددگار ہوتا ہے۔ حواریوں نے کہا ہم ہیں اللہ کے مددگار، پس بنی اسرائیل میں سے کچھ لوگ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے انکار کیا۔ پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں مدد کی، پس وہ غالب ہو گئے (الصف ۱۴)

اس آیت میں پیغمبر اسلام کے ساتھیوں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ حضرت مسیح کے ساتھیوں کی پیروی کریں۔ اس کے مطابق، حضرت مسیح کی دعوت کے نتیجہ میں وہاں دو گروہ بن گئے۔ ایک انصار مسیح اور دوسرے اعداء مسیح۔ پھر ان دونوں کے درمیان مقابلہ ہوا جس کے نتیجہ میں قرآن کے مطابق، یہ واقعہ پیش آیا کہ اعداء مسیح کے اوپر انصار مسیح غالب آ گئے۔ قرآن کی یہ شہادت واضح طور پر بتاتی ہے کہ حضرت مسیح کے یہاں بھی اسی طرح نرمی اور سختی دونوں کی تعلیم موجود تھی جس طرح وہ پیغمبر اسلام کے یہاں موجود ہے۔

مطالعہ سیرت کا مذکورہ طریقہ نہ صرف بے اصل ہے بلکہ وہ امت کے درمیان غیر علمی طرز فکر پیدا کرنے والا ہے۔ ایسے طریق مطالعہ کے ماحول میں کبھی علمی اسلوب فروغ نہیں پا سکتا۔

سیرت رسول کی عظمت

قرآن میں پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اور کارنامے کو نہایت پر عظمت انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ :
ومآارسلنا ك الا رحمة للعالمين(الانبياء ۱۰۷) یعنی ہم نے تم کو سارے عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اپنے مشن کے ذریعہ ایک ایسا کارنامہ انجام دیں گے جو دنیا کے تمام انسانوں کے لئے رحمت کا سبب بن جائے۔ اس سلسلہ میں یہاں دو اور آیتیں نقل کی جاتی ہیں:

محمد رسول الله والذين معه اشد اء على الكفار رحماء بينهم ترا هم ركعا سجدا يبتغون فضلا من الله ورضونا سيماهم فى وجوههم من اثر السجود ذالك مثلهم فى التوارةومثلهم فى الانجيل كزرع اخرج شطاه فأزروه فاستغلظ فاستوى على سوقه يعجب الزراع ليغيظ بهم الكفار وعد الله الذين امنوا وعملوا الصالحات منهم مغفرة واجرا عظيما(الفتح ۲۹)

محمد اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ منکروں پر سخت ہیں اور آپس میں مہربان ہیں۔ تم ان کو رکوع میں اور سجدہ میں دیکھو گے، وہ اللہ کا فضل اور اس کی رضامندی کی طلب میں لگے رہتے ہیں۔ ان کی نشانی ان کے چہروں پر ہے سجدہ کے اثر سے، ان کی یہ مثال تورات میں ہے۔ اور انجیل میں ان کی مثال یہ ہے کہ جیسے کھیتی، اس نے اپنا

انکھوا نکالا، پھر اس کو مضبوط کیا، پھر وہ اور موٹا ہوا، پھر اپنے تنے پر کھڑا ہو گیا، وہ کسانوں کو بھلا لگتا ہے تاکہ ان سے کافروں کو جلائے۔ ان میں سے جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کیا اللہ نے ان سے معافی کا اور بڑے ثواب کا وعدہ کیا ہے۔

یریدون ان یطفؤ ا نور الله بافواههم ویابی الله الا ان یتم نوره ولو کره الکفرون هو الذی ارسل رسوله بالهدیٰ ودین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشر کون (التوبه ۳۲.۳۳)

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منہ سے بجھادیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کئے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کردے خواہ یہ مشرکین کو کتنا ہی ناگوار ہو۔

قرآن کی ان آیتوں کے مطالعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت کوئی سادہ بات نہ تھی۔ وہ ایک عظیم انقلابی منصوبہ تھا۔ آپ کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ کو ایک عظیم واقعہ ظہور میں لانا تھا، ایک ایسا واقعہ جو پوری انسانی تاریخ کے رخ کو بدل دے۔ یہ آیتیں مزید یہ بتاتی ہیں کہ اس عظیم اور عالمی منصوبہ کے لئے مقدر ہے کہ وہ لازمی طور پر ظہور میں آئے۔ کسی کی مخالفت اس کو ظہور میں آنے سے روک نہیں سکتی۔

قرآن کا یہ اعلان انتہائی واضح ہے۔ اور چونکہ وہ ایک خدائی اعلان ہے اس لئے لازمی طور پر اس کو ظہور میں آنا چاہئے۔ مگر سیرت کی موجودہ کتابیں پیغمبر کے اس عظیم کارنامہ کی تصویر نظر نہیں آتیں۔ یہ کتابیں بظاہر اس سے کم دکھائی دیتی ہیں جیسا کہ انھیں مذکورہ قرآنی آیتوں کی روشنی میں دکھائی دینا چاہئے۔ خالص علمی اعتبار سے جائزہ لیا جائے تو

شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کتابیں کسی قاری کی اس امید کو پورا نہیں کرتیں جس کو وہ ازروئے قرآن ان کتابوں میں پانا چاہتا ہے۔

یہ صحیح ہے کہ سیرت کی ان کتابوں میں عقیدت مندانہ الفاظ کی کثرت ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کی پیدائش کا ذکر سادہ الفاظ میں نہ کر کے اس طرح کہنا کہ آفتاب رسالت طلوع ہوا۔ یا آپ کی وفات کو سادہ الفاظ میں نہ لکھ کر اس طرح کہنا کہ آفتاب رسالت غروب ہو گیا۔ مگر اس قسم کے اسلوب کی حیثیت لفظی مدح و منقبت کی ہے نہ کہ ایک حقیقت کے علمی اور تاریخی اظہار کی۔ اور مدحیہ الفاظ کی کوئی بھی مقدار علمی اظہار کا بدل نہیں بن سکتی۔

ضرورت ہے کہ سیرت کے موضوع پر ایسی کتابیں لکھی جائیں جو مذکورہ قرآنی آیتوں سے مطابقت رکھتی ہوں اور حقیقی معنوں میں اس کی تشریح و تفسیر بن سکیں۔ زیر نظر کتاب اسی قسم کی ایک ابتدائی کوشش ہے۔

حیاتِ رسول

پیغمبر اسلام ﷺ کا نام محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب تھا۔ آپ ۵۷۰ء میں مکہ میں پیدا ہوئے، اور ۶۳۲ء میں مدینہ میں آپ کی وفات ہوئی۔ آپ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ آپ کے حالات یہاں مختصر طور پر درج کئے جاتے ہیں۔

آپ ابھی رحم مادر میں تھے کہ آپ کے والد عبداللہ کا انتقال ہو گیا۔ پیدائش کے چند ہی سال بعد آپ کی والدہ آمنہ بھی انتقال کر گئیں۔ عرب کی قدیم روایت کے مطابق ایک صحرائی خاتون حلیمہ سعدیہ نے آپ کی ابتدائی پرورش کی۔ والد کی غیر موجودگی مین آپ کے دادا عبدالمطلب آپ کی کفالت کرتے رہے۔ دادا کے انتقال کے بعد آپ کے چچا ابو طالب آپ کے کفیل بنے۔ ابو طالب ایک تاجر تھے چنانچہ آپ نے ان کے ساتھ بعض تجارتی سفر بھی کئے۔ ۲۵ سال کی عمر میں آپ نے مکہ کی ایک چالیس سالہ بیوہ خاتون خدیجہ بنت خویلد سے نکاح کیا۔

آپ کی عمر جب چالیس سال کی ہوئی، اس وقت خدا کی پہلی وحی آپ پر نازل ہوئی۔ آپ مکہ کے قریب حرا نامی ایک غار میں تھے۔ آپ یہاں اکثر تنہائی کی تلاش میں آیا کرتے تھے۔ یہاں فرشتہ جبریل آپ کے پاس آئے اور یہ خبر دی کہ آپ کو اللہ نے اپنا پیغمبر بنایا ہے۔ آپ پر جو پہلی آیتیں اتریں وہ سورہ العلق کے آغاز میں موجود ہیں۔

قرآن ایک ہی وقت میں ایک کتاب کی صورت میں نہیں اترا۔ بلکہ وہ تھوڑا تھوڑا کر کے اترا۔ اس طرح ۲۳ سال کی مدت میں اس کی تکمیل ہوئی۔ قرآن کی حفاظت کے لئے اول دن ہی سے غیر معمولی اہتمام کیا گیا تھا۔ جب قرآن کا کوئی حصہ اترنے والا ہوتا تو

جبریل آپ کے پاس آتے اور قرآن کا وہ جز ٔ آپ کو پڑھ کر سناتے۔ پیغمبر اسلام پہلے خود اس کو اچھی طرح یاد کر لیتے پھر اس کے بعد آپ اس کو بول کر لکھواتے۔ پیغمبر اسلام خود لکھنا نہیں جانتے تھے مگر آپ نے اپنے ساتھیوں میں سے بہت سے لوگوں کو اس کام کے لئے مقرر کر لیا تھا۔ یہ لوگ کاتبان وحی کہے جاتے تھے۔ کوئی نہ کوئی کاتب وحی ہر وقت آپ کے پاس موجود رہتا تھا۔ تاکہ اترے ہوئے حصہ ٔ قرآن کو فوراً اسی وقت لکھ لے۔ اس معاملہ میں آپ اتنا زیادہ اہتمام کرتے تھے کہ ہجرت کے نازک سفر میں بھی ایک کاتب وحی، ابو بکر صدیق، کو آپ نے اپنے ساتھ رکھا۔ ان کے ساتھ دوسری ضروری چیزوں کے علاوہ قلم اور کاغذ بھی تھا تاکہ سفر کے دوران اگر قرآن کا کوئی حصہ اترے تو اسی وقت اس کو لکھ لیا جائے۔

کتابت کے ساتھ قرآن کی حفاظت کا دوسرا اہتمام یہ کیا گیا تھا کہ اکثر صحابہ قرآن کے اترے ہوئے حصہ کو یاد کر لیتے تھے اور اس کو روزانہ اپنی نمازوں میں پڑھتے تھے۔ اس طرح قرآن کی حفاظت بیک وقت دو طریقوں سے ہوتی رہی۔ ایک طرف اس کو اس زمانہ کے کاغذ پر لکھا جاتا رہا اور دوسری طرف اس کو یاد کر کے انسانی حافظہ میں محفوظ کیا جاتا رہا۔

یہاں تک کہ جب پورا قرآن نازل ہو گیا تو جبریل پیغمبر اسلام کے پاس آئے۔ انھوں نے قرآن کی موجودہ ترتیب کے ساتھ سورۃ الفاتحہ سے لے کر سورۃ الناس تک پڑھ کر اس کو سنایا۔ پھر پیغمبر اسلام نے اسی ترتیب کے ساتھ تمام صحابہ کو پورا قرآن پڑھ کر سنایا۔ اس طرح صحابہ میں بہت سے لوگ ایسے ہو گئے جن کو قرآن موجودہ ترتیب کے ساتھ یاد تھا۔ وہ اس کو روزانہ نماز کے اندر اور نماز کے باہر پڑھتے اور دوسروں کو سناتے۔

اس طرح قرآن خود پیغمبر اسلام کی زندگی ہی میں اپنی موجودہ صورت میں مدون

ہو گیا تھا۔ آپ کے بعد خلیفہ ابو بکر نے یہ کیا کہ اس مدون قرآن کو ایک جلد کی صورت میں تیار کروا یا۔ پھر دھیرے دھیرے اس کی نقلیں تمام شہروں میں پھیل گئیں۔

نبوت ملنے کے بعد آپ کی زندگی بدل گئی۔ آپ نے غار حرا جانا چھوڑ دیااور لوگوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے میں مصروف ہو گئے۔ اس وقت مکہ میں شرک پھیلا ہوا تھا۔ آپ نے لوگوں کو بتانا شروع کیا کہ شرک ایک بے اصل مذہب ہے۔ صحیح مذہب یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کا پرستار بنے اور اسی کے احکام کو مانے۔ اور اسی کی مرضی کے مطابق اپنی زندگی گذارے۔ آخرت میں موحدانہ مذہب کی قیمت ہو گی، مشرکانہ مذہب آخرت میں قبول نہیں کیا جائے گا۔ اللہ موحدین کو جنت میں داخل کرے گا اور مشرکین کو جہنم میں۔

آپ کی دعوت کا طریقہ زیادہ تر یہ ہو تا تھا کہ آپ لوگوں سے مل کر انھیں قرآن کا کوئی حصہ سناتے۔ کبھی لوگوں کے مجمع میں جا کر یہ کہتے کہ ایھاالناس قولوالاالہٰ الا اللہ تفلحوا (اے لوگو، یہ کہو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، تم فلاح پاؤ گے) اس طرح آپ شرک کے مقابلہ میں توحید کی دعوت دیتے رہے۔

شروع شروع میں آپ نے انفرادی دعوت کا طریقہ اختیار کیا۔ تقریباً تین سال کے بعد آپ نے کھل کر اعلان کے ساتھ لوگوں کو دعوت دی۔ اب لوگوں کی طرف سے مخالفت شروع ہو گئی۔ آپ توحید کی دعوت دیتے تھے۔ اس وقت مکہ کے لوگ، اور اسی طرح عرب کے تمام قبائل شرک کو اپنا مذہب بنائے ہوئے تھے۔ اس بنا پر ان لوگوں کی مخالفت فطری تھی۔ ان لوگوں کو محسوس ہوا کہ آپ ان کو ان کے آبائی مذہب سے ہٹانا چاہتے ہیں اور ان کو ایک نئے مذہب کا پیرو بنانا چاہتے ہیں۔ یہ بات ان کے لئے قابل برداشت نہیں ہو سکتی تھی۔

مزید یہ کہ مکہ والوں کے لئے شرک کا ایک تجارتی پہلو بھی تھا۔ مکہ میں زراعت یا اور کوئی ذریعہ معاش موجود نہ تھا۔ البتہ وہاں حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا مقدس کعبہ تھا۔ مکہ کے سرداروں نے اس کعبہ میں عرب کے تمام قبائل کے بت رکھ دیئے تھے۔ جن کی تعداد ۳۶۰ تھی۔ عرب کے لوگ تقریباً سال بھر کعبہ کی اور ان بتوں کی زیارت کے لئے آتے تھے۔ یہ لوگ نہ صرف کعبہ میں نذرانے دیتے تھے بلکہ ان کی آمد سے مکہ کی تجارت کو بھی فروغ حاصل ہوتا تھا۔ ان دوگونہ اسباب سے مکہ کے بیشتر لوگ پیغمبر اسلام کے شدید مخالف بن گئے۔

تاہم مکہ کے سنجیدہ افراد نے آپ کے پیغام کی صداقت کو محسوس کیا۔ یہ لوگ دھیرے دھیرے اسلام قبول کرنے لگے یہاں تک کہ ۱۳سال کے دعوتی عمل کے بعد مکہ اور اطراف مکہ کے تقریباً دوسو مرد اور عورت اسلام میں داخل ہوگئے۔

مکہ کی سرداری قبیلہ قریش کے ہاتھ میں تھی۔ اس قبیلہ کے سردار مثلاً، ابوجہل اور ابولہب وغیرہ آپ کے شدید مخالف بن گئے۔ انھوں نے پہلے تو مخالفت کے ذریعہ کوشش کی کہ آپ کا دین وہاں پھیلنے نہ پائے۔ مگر انھوں نے محسوس کیا کہ ان کی یہ کوشش زیادہ کامیاب نہیں ہورہی ہے۔ اس دوران آپ کے چچا ابوطالب کا بھی انتقال ہوگیا جو قریش کے سردار بھی تھے اور آپ کے سرپرست اور حمایتی بھی۔

ابوطالب کی وفات کے بعد مکہ کے سرداروں کی دشمنی بہت بڑھ گئی۔ وہ بے روک ٹوک آپ کے خلاف کارروائیاں کرنے لگے۔ اس وقت آپ نے محسوس کیا کہ مکہ کے حالات اب آپ کے لئے سازگار نہیں ہیں۔ چنانچہ آپ نے اپنے ساتھیوں کو اجازت دے دی کہ وہ وقتی طور پر مکہ کو چھوڑ کر پڑوسی ملک حبش چلے جائیں۔ آپ نے اپنے لئے یہ فیصلہ

فرمایا کہ عرب کی ایک اور بستی طائف جائیں اور وہاں اپنے لئے حمایتی تلاش کریں۔ چنانچہ آپ مکہ سے سفر کر کے طائف گئے۔ اس سفر میں صرف آپ کے خادم زید آپ کے ساتھ شریک تھے۔

تاہم اس سفر کا کوئی مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔ طائف کے سردار بھی مکہ والوں کی طرح آپ کے مخالف ہو گئے۔ انھوں نے آپ کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ چنانچہ آپ طائف سے واپس ہو کر دوبارہ مکہ آ گئے۔ تاہم مکہ میں رہنے کے لئے کسی سردار کی حمایت ضروری تھی۔ ابھی جب کہ آپ مکہ کی سرحد پر تھے، آپ نے اپنے خادم کے ذریعہ مکہ کے ایک مشرک سردار مطعم بن عدی کے پاس پیغام بھیجا اور یہ کہلایا کہ تم مجھ کو اپنی حمایت میں لے لو تاکہ میں مکہ میں قیام کر سکوں۔ عرب کے قدیم قبائلی نظام کے تحت ایسا کرنا ضروری تھا۔ مطعم بن عدی کی رضامندی سے آپ مکہ میں داخل ہوئے تاہم مکہ کے سرداروں کی مخالفت اتنی زیادہ بڑھ چکی تھی کہ آپ کے لئے مکہ میں رہنا ممکن نہ تھا۔ چنانچہ مکہ میں ۱۳ سال قیام کے بعد آپ خاموشی کے ساتھ مدینہ چلے گئے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد آپ نے وہاں کے پہلے جمعہ میں جو پہلا خطبہ ارشاد فرمایا اس کو ابن ہشام نے پورا کا پورا نقل کیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے:

حمد و ثنا کے بعد آپ نے فرمایا کہ اے لوگو، اپنے آگے کے لئے بھیجو۔ جان لو کہ تمہارے اوپر ضرور موت کا وقت آئے گا اور پھر تم اپنی بکریوں کو اس طرح چھوڑ کر چلے جاؤ گے کہ ان کا کوئی چرواہا نہ ہو گا پھر ضرور ہر آدمی کا رب اس سے کہے گا، اور اس کے اور اس کے رب کے درمیان نہ کوئی ترجمان ہو گا اور نہ کوئی پردہ جو اس کو چھپائے۔ کیا تمہارے پاس میرا پیغمبر نہیں آیا، پھر اس نے تم کو میرا پیغام پہنچایا۔ اور میں نے تم کو مال دیا اور

تمہارے اوپر اپنا فضل کیا۔ پھر تم نے اپنے لئے آگے کیا بھیجا۔ پھر وہ آدمی دیکھے گا اپنے دائیں اور بائیں تو اس کو کچھ دکھائی نہ دے گا۔ پھر وہ اپنے آگے دیکھے گا تو اس کو جہنم کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے گا۔ پس تم میں سے جو شخص اس کی استطاعت رکھتا ہو کہ وہ اپنے چہرہ کو جہنم سے بچائے تو اس کو چاہئے کہ وہ اس کو بچائے خواہ کھجور کے ایک ٹکڑے کے ذریعہ کیوں نہ ہو۔ اور جو اس کو نہ پائے تو وہ ایک اچھی بات کے ذریعہ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کرے کیونکہ انسان کے ہر عمل کا بدلہ دس گنا سے لے کر سات سو گنا تک دیا جائے گا۔ اور تمہارے اوپر سلامتی ہو اور اللہ کی رحمت ہو۔

مکہ میں آپ ۱۳ سال تک رہے۔ وہاں نماز باجماعت فرض نہیں ہوئی تھی۔ ہجرت کے بعد نماز باجماعت فرض ہوئی۔ چنانچہ مدینہ پہنچ کر آپ نے سب سے پہلے جو کام کیا۔ ان میں سے ایک اہم کام یہ تھا کہ آپ نے مدینہ کے اندر ایک مناسب زمین خرید کر حاصل کی۔ اور اس کے اوپر وہ مسجد بنائی جو آج بہت زیادہ وسیع ہو کر مدینہ کی مسجد نبوی کے نام سے مشہور ہے۔ مسجد کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ : المساجد بیوت المتقین (مسجدیں متقیوں کا گھر ہیں) یعنی مسجدیں اہل ایمان کے لئے تقویٰ کی تربیت کا مرکز ہیں۔

مسجد کی تعمیر کے بعد آپ نے اس سے ملے ہوئے حجرہ میں قیام فرمایا۔ آپ نے یہاں باقاعدہ طور پر پانچ وقت کی نمازوں کا نظام قائم کیا۔۔ فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشا۔ اسی کے ساتھ آپ نے جمعہ کی نماز کا نظام قائم فرمایا جو ایک ہفتہ وار نماز ہے۔ اور زیادہ بڑی اجتماعی نماز کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس میں آپ نے نماز کے ساتھ خطبہ بھی شامل فرمایا جو اہل ایمان کی ہفتہ وار تذکیر و نصیحت کا ذریعہ ہے۔

مدینہ میں آپ نے تنظیم و استحکام کے مختلف کام کئے۔ مثلاً ہجرت کے بعد مدینہ کی

چھوٹی سی آبادی میں اچانک دوسو سے زیادہ آدمیوں کا اضافہ ہو گیا۔ یہ ایک بڑا سماجی مسئلہ تھا۔ آپ نے اس کے حل کے لئے وہ تدبیر اختیار فرمائی جس کو اسلام کی تاریخ میں مؤاخاۃ کہا جاتا ہے۔ اس کی صورت یہ تھی کہ آپ نے باہر سے آنے والے مہاجرین اور مدینہ میں رہنے والے انصار کے درمیان بھائی بھائی کا رشتہ قائم کر دیا۔ اس طرح ہر مہاجر کسی انصاری کے ساتھ اس کے گھر اور کاروبار میں بھائی کی طرح شریک ہو گیا۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ لوگ سگے بھائی کی طرح مل جل کر رہتے تھے۔ ان کے درمیان کبھی کسی معاملہ میں جھگڑا نہیں ہوا۔

کچھ دنوں کے بعد اپنے آپ اس مؤاخاۃ کی ضرورت نہ رہی۔ باہر سے آنے والے مسلمان جن کو مہاجر کہا جاتا تھا، ان کو یہ پسند نہ تھا کہ وہ کسی اور کے اوپر بوجھ بنیں۔ چنانچہ ہر ایک سرگرمی کے ساتھ کسی نہ کسی کام میں لگ گیا۔ کسی نے مزدوری کی، کوئی زراعت اور تجارت میں مشغول ہو گیا۔ اس طرح تھوڑے دنوں کے بعد ان میں سے ہر ایک خود اپنی معاشی بنیاد پر کھڑا ہو گیا۔

دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت کے مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔ پیغمبر اسلام نے اس مسئلہ کے حل کے لئے ایک منشور جاری کیا۔ جس کو عام طور پر صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔ مدینہ میں چونکہ مسلمانوں کی اکثریت تھی، اس لئے آپ کی حیثیت وہاں مدینہ کے سردار یا حاکم کی ہو گئی۔

آپ نے اپنی اس حاکمانہ حیثیت کے تحت صحیفۂ مدینہ میں یہ اعلان فرمایا کہ یہاں کے تمام لوگوں کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ ہر ایک کو اس کے مذہب اور کلچر کی آزادی ہوگی۔ مسلمانوں کے معاملات شریعت کے مطابق طے کئے جائیں گے۔ اور

مشرکین اور یہود کے معاملات ان کی اپنی روایات یا قبائلی رواج کے مطابق طے ہوں گے۔

مکہ کے برعکس، مدینہ آپ کی دعوت توحید کے لئے سازگار ثابت ہوا۔ آپ کی آمد سے پہلے ہی مدینہ میں اسلام داخل ہو چکا تھا۔ آپ کے یہاں آنے کے بعد اس میں مزید اضافہ ہوا یہاں تک کہ تھوڑی مدت میں مدینہ کے بیشتر لوگ اسلام قبول کر کے آپ کے ساتھی بن گئے۔

یہ صورت مکہ کے سرداروں کو پسند نہیں آئی۔ انھیں یہ گوارہ نہیں ہوا کہ جس شخص کو انھوں نے مکہ سے نکال دیا تھا، وہ مدینہ پہنچ کر اپنے لئے ایک مضبوط مرکز بنالے اور آخر کار ان کے مذہبِ شرک کے لئے شدید تر خطرہ بن جائے۔ اپنے اس احساس کی بنا پر انھوں نے پیغمبر اسلام کے خلاف جنگی اقدام کا فیصلہ کیا۔ انھوں نے چاہا کہ جس مذہب کو عام مخالفت کے ذریعہ وہ ختم نہیں کر سکے تھے اس کو تلوار کی طاقت سے ختم کر دیں۔

ہجرت کے بعد مکہ کے سرداروں نے جارحانہ کارروائیاں شروع کر دیں۔ انھیں میں سے ایک واقعہ وہ ہے جس کو بدر الاولیٰ کہا جاتا ہے۔ تاہم پیغمبر اسلام اور مکہ کے سرداروں کے درمیان پہلا بڑا مقابلہ وہ ہے جو غزوہ بدر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ جنگ مکہ کے سرداروں کی جارحیت کے نتیجہ میں پیش آئی۔ بدر کے مقام پر ۲ھ میں دونوں گروہوں کے درمیان مسلح ٹکراؤ ہوا۔ خدا کی خصوصی مدد سے پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھی کامیاب ہوئے۔ مکہ کے لوگ ستر کی تعداد میں مارے گئے اور اتنی ہی تعداد میں قیدی بنائے گئے۔

بدر کی شکست نے مکہ کے سرداروں کو اور زیادہ بھڑکا دیا۔ وہ اپنے عوام کو یہ کہہ کر ایک اور جنگ پر ابھارنے لگے کہ ہمیں اپنے بدر کے مقتولین کا انتقام لینا ہے۔ اس کے نتیجہ

میں کئی بار دونوں طرف کے لوگوں کے درمیان چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں۔ یہاں تک کہ ۳ھ میں انھوں نے ایک بڑا لشکر تیار کیا اور اس کو لے کر مدینہ کی سرحد پر پہنچ گئے۔ یہاں احد پہاڑ کے پاس دونوں گروہوں کے درمیان شدید جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں پہلے اہلِ ایمان غالب آئے۔ اس کے بعد ایک غلطی سے فائدہ اٹھا کر مکہ کی فوج نے دوبارہ مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ اس دوبارہ حملہ میں اہل ایمان ٹھہر نہ سکے اسلامی فوج کے کئی لوگ قتل ہو گئے۔ آخر کار اہل مکہ کو فتح حاصل ہوئی۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے محسوس کیا کہ بظاہر جنگ سے اس معاملہ کا فیصلہ ہونے والا نہیں۔ چنانچہ آپ نے ایک اور تدبیر اختیار کی۔ ۶ھ میں ایک خواب کے مطابق آپ نے اعلان فرمایا کہ ہم مکہ جائیں گے اور وہاں کعبہ کا طواف اور عمرہ کی عبادت ادا کریں گے۔ اس کے مطابق تقریباً چودہ سو ساتھیوں کے ہمراہ آپ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ ایک پرامن سفر تھا۔ اور اس کا جنگ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

مکہ میں اس طرح کے پرامن وفود کی آمد کوئی نئی بات نہ تھی۔ عرب کے مختلف قبائل کعبہ کی زیارت کے لئے برابر آتے رہتے تھے۔ مگر مکہ کے سرداروں کے لئے یہ چیز قابل برداشت نہ تھی۔ چنانچہ پیغمبر اسلام جب چلتے ہوئے حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے سرداروں نے وہاں آکر آپ کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ مکہ کے سرداروں نے اس کو اپنے وقار کے خلاف سمجھا کہ جن لوگوں کو انھوں نے مکہ سے نکال دیا ہے، وہ دوبارہ مکہ آئیں اور اس طرح نمایاں طور پر وہاں عمرہ کی رسم ادا کریں۔

اب پیغمبر اسلام حدیبیہ میں ٹھہر گئے اور مکہ کے سرداروں سے صلح کی گفتگو شروع کر دی۔ اس گفتگو میں تقریباً ۱۵ دن لگ گئے۔ آخر کار دونوں فریقوں کے درمیان صلح کا دہ

معاہدہ ہوا جو معاہدہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ پیغمبر اسلام نے اس معاہدہ میں مکہ والوں کی تمام شرطوں کو یکطرفہ طور پر منظور کرلیا۔ البتہ آپ کی تجویز پر اس میں ایک دفعہ یہ شامل کی گئی کہ آئندہ دس سال تک اہل اسلام اور قریش مکہ کے درمیان جنگ نہیں ہوگی، نہ براہ راست اور نہ بالواسطہ۔ اس معاہدہ کی تکمیل کے بعد آپ حدیبیہ سے مدینہ واپس آگئے۔

معاہدۂ حدیبیہ کے بعد جنگ کا خطرہ ٹل گیا اور آپ کو سکون حاصل ہوگیا۔ اب پیغمبر اسلام نے اپنی دعوت کو مضبوط اور مستحکم کرنے کا کام شروع کردیا۔ اس سلسلہ کا ایک کام یہ تھا کہ آپ نے عرب کی سرحد پر بسنے والے حکمرانوں اور بادشاہوں کے نام دعوتی خطوط روانہ فرمائے۔ مثلاً شام اور مصر وغیرہ کے حاکموں کے نام۔

آپ کے اصحاب آپ کے دعوتی خطوط کو لے کر ان حاکموں کے پاس گئے۔ ان میں سے صرف ایک نے آپ کے مکتوب کے ساتھ برا معاملہ کیا۔ یہ ایران کا بادشاہ کسریٰ تھا۔ اس نے ایسے ایک خط کو اپنی شان کے خلاف سمجھا اور اس کو پھاڑ کر پھینک دیا۔ آپ کو جب یہ خبر بتائی گئی تو آپ نے فرمایا کہ کسریٰ نے خود اپنی سلطنت کے ٹکڑے کردئے۔

اس کے علاوہ بقیہ حاکموں اور بادشاہوں نے آپ کے بھیجے ہوئے مکتوب کے ساتھ عزت واحترام کا معاملہ کیا۔ کئی حاکموں نے آپ کے سفیروں کو تحفہ اور ہدیہ کے ساتھ واپس کیا۔ ان میں سے بعض نے اسلام قبول کرلیا، جیسے کہ حبش کا بادشاہ نجاشی۔

حدیبیہ کا معاہدہ اگرچہ بظاہر مکہ والوں کی موافقت میں تھا۔ مگر اس کا ایک عظیم فائدہ اسلام کے حق میں برآمد ہوا۔ وہ اس طرح کہ جب یہ مشہور ہوگیا کہ پیغمبر اسلام اور قریش

مکہ کے درمیان ناجنگ معاہدہ ہو گیا ہے تو دونوں فریقوں کے درمیان پر امن ماحول قائم ہو گیا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں کے درمیان کھلی آمدورفت ہونے لگی۔ مکہ اور دوسرے عرب قبائل کے لوگ مدینہ آنے لگے۔ اسی طرح مدینہ کے مسلمان دوسرے مشرک قبائل میں جانے لگے۔

اس آزادانہ اختلاط کے دوران اپنے آپ ایسا ہوا کہ اسلام زیر بحث آنے لگا۔ اہل شرک اور اہل توحید کے درمیان کھلے طور پر چرچا ہونے لگا۔ اس کے نتیجہ میں اسلام کی دعوت نہایت تیزی کے ساتھ ہر طرف پھیل گئی۔ عرب کے لوگ اسلام کی خوبیوں سے واقف ہو کر بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ صرف دو سال کے اندر اہل اسلام کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو گیا۔

اب ایسا ہوا کہ قریش مکہ کے کچھ لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کے ایک حلیف قبیلہ کے خلاف جارحانہ کارروائی کی۔ یہ معاملہ حدیبیہ کے معاہدہ کے سراسر خلاف تھا۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے معاہدہ حدیبیہ کے خاتمہ کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد آپ اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے سفر کے وقت آپ کے ساتھ صرف چودہ سو آدمی تھے۔ اس کے مقابلہ میں موجودہ سفر میں آپ کے ساتھیوں کی تعداد دس ہزار تھی۔ عددی طاقت میں یہ اضافہ اتنا زیادہ تھا کہ مکہ کے لوگ اس کا مقابلہ کرنے سے عاجز تھے۔ چنانچہ انھوں نے مقابلہ کے بغیر ہار مان لی، اور کسی جنگ کے بغیر مکہ فتح ہو گیا۔ یہ واقعہ ۸ھ کا ہے۔

مکہ کے مشرکین نے پیغمبر اسلام کی نہایت شدید مخالفت کی تھی۔ وہ آپ کے قتل کے درپے ہو گئے تھے۔ انھوں نے آپ کو جنگوں میں الجھایا۔ اس طرح کی مختلف سنگین

زیادتیوں کے بعد ان کی حیثیت بدترین مجرم کی ہو چکی تھی۔ حتی کہ اگر یہ لوگ قتل کر دیئے جاتے تو ان کے جرائم کے اعتبار سے یہ ایک جائز فعل ہوتا۔ لیکن پیغمبر اسلام نے بلند اخلاقی سے کام لیتے ہوئے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ حتی کہ آپ نے ان کو ملامت بھی نہیں فرمائی۔ آپ نے یکطرفہ طور پر ان سب کی معافی کا اعلان کر دیا اور کہا کہ جاؤ تم سب لوگ آزاد ہو۔

اس وقت کے حالات میں یہ ایک غیر معمولی سلوک تھا۔ مکہ کے مشرکین یہ سمجھے ہوئے تھے کہ فتح کے بعد اب انھیں ان کے ناقابل معافی جرائم کی بنا پر قتل کر دیا جائے گا۔ لیکن پیغمبر اسلام نے بلا شرط ان سب کو معاف کر دیا۔ اس غیر معمولی سلوک نے ان کے ضمیر کو بری طرح جھنجھوڑ دیا۔ انھوں نے محسوس کیا کہ اب سرکشی کا طریقہ ان کے لئے کسی بھی طرح جائز نہیں۔ اتنے بڑے انسانی سلوک کے بعد اب انھیں پیغمبر اسلام کے دین میں داخل ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور مکہ کے تمام لوگ اسلام قبول کر کے آپ کے ساتھی بن گئے۔

اس کے بعد پیغمبر اسلام نے مکہ میں ایک شخص کو اپنی طرف سے حاکم مقرر فرمایا اور پھر مکہ سے طائف کی طرف روانہ ہوئے۔ اس سفر میں آپ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی تھے۔ راستہ چلتے ہوئے آپ اس مقام پر پہنچے جس کو قدیم زمانہ میں حنین کہا جاتا تھا۔ یہاں آپ کا راستہ دو پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ پہاڑیوں کے اوپر قبیلہ ھوازن کے لوگ آباد تھے۔ آپ خاموشی کے ساتھ اپنا راستہ طے کر رہے تھے کہ اچانک قبیلہ ہوازن کے لوگوں نے اس وقت آپ کے اوپر تیروں سے حملہ کر دیا جب کہ آپ اور آپ کے ساتھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان تھے۔

آپ اور آپ کے ساتھی اس اچانک حملہ کے لئے تیار نہ تھے۔ چنانچہ ابتدائی مرحلہ میں بھگدڑ کی کیفیت پیدا ہو گئی۔ لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ مگر پیغمبر اسلام اپنی جگہ جمے رہے۔ آپ نے پکار کر کہا کہ اے اللہ کے بندو، میری طرف آؤ (الی عباد اللہ) اس آواز کو سن کر لوگوں کو ہوش آیا۔ وہ دوبارہ پلٹ کر آگئے اور پھر جم کر دشمن کا مقابلہ کیا۔ یہاں تک کہ پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کو فتح حاصل ہوئی۔ اس واقعہ کو اسلامی تاریخ میں غزوہ حنین کہا جاتا ہے۔

اس فتح کے بعد قبیلہ ہوازن کے چھ ہزار آدمی گرفتار کر لئے گئے۔ بہت بڑی تعداد میں اونٹ اور بکری وغیرہ مال غنیمت کے طور پر حاصل ہوا۔ یہ چھ ہزار قیدی ثابت شدہ طور پر جنگی مجرم کی حیثیت رکھتے تھے۔ عام رواج کے مطابق وہ اس قابل تھے کہ ان کو قتل کر دیا جائے۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ان سب کو بلا شرط معاف کر کے رہا کر دیا۔ آپ کا یہ غیر معمولی سلوک ان لوگوں کے لئے بے حد اثر انگیز تھا۔ چنانچہ قبیلہ ہوازن کے تمام مرد اور عورت اسلام قبول کر کے آپ کے دین میں داخل ہو گئے۔

اس کے بعد آپ طائف کی طرف بڑھے۔ طائف قدیم عرب کا واحد ایسا شہر تھا جس کے چاروں طرف حصار کے لئے دیواریں بنائی گئی تھیں۔ طائف والوں نے حصار کے دروازے بند کر لئے۔ اس طرح وہ قلعہ کی مانند محفوظ ہو گئے۔ پیغمبر اسلام نے طائف میں زیادہ قیام نہیں فرمایا بلکہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ کر مدینہ واپس آگئے۔

قدیم عرب میں مکہ کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ لوگوں نے مکہ کو قائدانہ مقام دے رکھا تھا۔ اب مکہ فتح ہو گیا اور وہاں کے لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔ چنانچہ وہاں پیغمبر اسلام کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اس کے بعد ساری صورت حال بدل گئی۔ اب عرب کے قبائل

نے محسوس کیا کہ انہیں بھی وہی دین اختیار کر لینا چاہئے جو مکہ والوں کا دین ہے یعنی اسلام۔

اس کے بعد پورے عرب میں ایک نیا عمل شروع ہو گیا۔ وہ یہ کہ ملک کے مختلف حصوں میں بسنے والے قبائل وفد کی شکل میں اپنے نمائندے مدینہ بھیجنے لگے تاکہ وہ اسلام میں داخل ہو جائیں اور پیغمبر اسلام سے نیا عہد کر کے اسلامی ریاست کے ساتھ اپنے تعلقات کو درست کریں۔ اس سال اس طرح کے وفد اتنی زیادہ تعداد میں آئے کہ اس سال کو عام الوفود کہا جانے لگا۔ اس طرح ایک کے بعد ایک تمام قبیلے اسلام کے دائرے میں داخل ہو گئے۔ انھیں میں سے ایک طائف کا قبیلہ بھی تھا۔

عرب میں اسلام کی طاقت کو مستحکم کرنے کے بعد آپ نے حج کا ارادہ فرمایا۔ اس کو اسلام کی تاریخ میں حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اپنی عمر کے آخری سال آپ مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ اس سفر میں مدینہ کے مسلمان آپ کے ساتھ ہو گئے۔ اس کے علاوہ جب ملک میں خبر پھیلی تو چاروں طرف سے مختلف قبائل کے افراد مکہ آنے لگے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام نے اپنا پہلا اور آخری حج ادا فرمایا تو اس وقت تقریباً سوا لاکھ آدمی اس عظیم عبادت میں آپ کے ساتھ شریک تھے۔ اس حج کے موقع پر آپ نے لوگوں کو جو تعلیمات دیں ان میں سے ایک آپ کا وہ خطبہ تھا جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ یہ خطبہ گویا اسلام کا ابدی منشور تھا۔ اس خطبہ میں آپ نے فرمایا:

بے شک تمہارے خون اور تمہارے مال تمہارے اوپر حرام ہیں، جس طرح تمہارا یہ دن تمہارے اس مہینہ میں تمہارے اس شہر میں حرام ہے۔ سن لو کہ جاہلیت کے معاملہ کی ہر چیز میرے قدموں کے نیچے ہے اور جاہلیت کے تمام خون باطل کر دئے گئے اور سب

سے پہلا خون جو میں باطل کرتا ہوں وہ ہمارا خون، ربیعہ بن حارث کا خون ہے۔ اور جاہلیت کے تمام سود باطل ہیں۔ اور سب سے پہلا سود جو میں باطل کرتا ہوں وہ ہمارے خاندان کا سود، عباس بن عبدالمطلب کا سود ہے۔ وہ سب کا سب باطل ہے۔ تم لوگ عورتوں کے معاملہ میں خدا سے ڈرو۔ تم نے ان کو اللہ کی امانت کے طور پر حاصل کیا ہے۔ اور ان کی شرمگاہوں کو اللہ کے کلمہ سے حلال کیا ہے۔ تمہارے اوپر ان کا حق یہ ہے کہ تم ان کو معروف طریقہ پر کھانا اور کپڑا دو۔ اور میں تمہارے درمیان ایک چیز چھوڑ رہا ہوں۔ اگر تم اس کو مضبوطی سے پکڑو گے تو تم گمراہ نہ ہوگے۔ وہ چیز خدا کی کتاب ہے۔

اے لوگو، کیا تم جانتے ہو کہ تم کس مہینہ میں ہو اور تم کس دن میں ہو اور تم کس شہر میں ہو۔ لوگوں نے کہا کہ حرام دن اور حرام شہر اور حرام مہینہ میں۔ آپ نے فرمایا کہ تمہارے خون اور تمہارے مال اور تماری عزتیں تمہارے اوپر اسی طرح قیامت تک کے لئے حرام ہیں جس طرح تمہارا یہ دن، تمہارا یہ مہینہ اور تمہارا یہ شہر حرام ہے۔

پھر فرمایا میری بات سنو اور اس کے مطابق عمل کرو۔ خبردار، ظلم نہ کرنا، خبردار ظلم نہ کرنا۔ بے شک کسی مسلمان کا کسی دوسرے کے مال کو لینا جائز نہیں۔ الّا یہ کہ وہ راضی ہو۔ سنو، جاہلیت کا ہر خون اور مال اور شرف قیامت تک کے لئے میرے دونوں قدموں کے نیچے ہیں۔ تمہارے لئے تمہارا راس المال ہے۔ نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تمہارے اوپر کوئی ظلم کیا جائے۔ سنو زمانہ گھوم گیا (پس وہ آج) اس نقطہ پر ہے جس دن خدا نے زمین و آسمان کو پیدا کیا تھا۔ پھر یہ آیت پڑھی: خدا کے نزیک مہینوں کی گنتی بارہ ہیں۔ خدا کی کتاب میں، جس دن اس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔ ان میں سے چار مہینے محترم ہیں۔ یہی سید ھا دین ہے پس تم ان میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو (التوبہ ۳٦)

سنو میرے بعد منکر نہ ہو جانا کہ آپس میں ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔ سنو شیطان اس سے مایوس ہو چکا ہے کہ نماز پڑھنے والے اس کی عبادت کریں، لیکن آپس میں تم کو برانگیختہ کر کے وہ اپنا مقصد حاصل کرے گا۔ اور عورتوں کے بارے میں اللہ سے ڈرو کیوں کہ وہ تمہاری دست نگر ہیں۔ وہ اپنے لئے کچھ نہیں کر سکتیں اور تمہارے اوپر ان کا حق ہے اور ان کے اوپر تمہارا حق۔ سنو، جس کے پاس کوئی امانت ہو تو وہ اس کو صاحب امانت کو واپس کر دے۔ اس کے بعد آپ نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے اور فرمایا کیا میں نے پہنچا دیا۔ کیا میں نے پہنچا دیا۔ پھر آپ نے کہا جو حاضر ہے وہ غیر حاضر کو پہنچا دے کیونکہ بہت سے وہ لوگ جنھیں پہنچایا جائے وہ سننے والوں سے زیادہ اخذ کرنے والے ہوتے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی وفات ہجری کیلنڈر کے لحاظ سے ۱۲ ربیع الاول ۱۰ھ کو ہوئی۔ آخری زمانہ میں آپ تقریباً دو ہفتہ بیمار رہے۔ وفات سے پہلے آپ نے مسجد نبوی میں جو آخری نماز ادا فرمائی اس میں اپنی موجودگی میں حضرت ابو بکر صدیق کو نماز کا امام بنایا۔

اسلام میں نماز با جماعت کے امام کی جو اہمیت ہے اس کے لحاظ سے یہ ایک واضح اشارہ تھا کہ میرے بعد ابو بکر مسلمانوں کے خلیفہ یا امیر المومنین ہوں گے۔

آخری زمانہ میں آپ نے جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک یہ تھی کہ: **ترکت فیکم امرین لن تضلو ما تمسکتم بھما کتاب اللہ وسنۃ رسولہ** (میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑی ہیں۔ تم اس وقت تک گمراہ نہ ہو گے جب تک تم ان دونوں کو پکڑے رہو گے۔۔۔ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت) مشکاۃ المصابیح ۱/۶۶

آپ کی وفات مسجد نبوی کے حجرہ میں ہوئی۔ اسی حجرہ میں آپ کی تدفین کی گئی۔ چنانچہ آج تک آپ کی قبر وہاں موجود ہے۔ بعد کو آپ کے خلفاء حضرت ابو بکر اور حضرت عمر فاروق کی وفات ہوئی تو ان کی تدفین بھی اسی مقام پر آپ کی قبر کے دونوں طرف ہوئی۔

قرآنی تصویر

قرآن (القلم ۴) میں پیغمبر اسلام ﷺ کی بابت فرمایا گیا ہے کہ .... اور بے شک تم ایک اعلیٰ اخلاق پر ہو (وانك لعلي خلق عظيم) اس آیت کی بہترین تفسیر وہ ہے جو حضرت عائشہؓ سے منقول ہے۔ حدیث کی مختلف کتابوں میں یہ روایت آئی ہے کہ آپ کی اہلیہ حضرت عائشہ سے کسی نے آپ کے اخلاق کے بارے میں پوچھا۔ انھوں نے جواب میں اسی آیت کا حوالہ دیا اور فرمایا: كان خلقه القرآن۔ یعنی آپ کا اخلاق قرآن تھا۔ (تفسیر ابن کثیر ۴؍۴۰۳)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی صحیح ترین تصویر وہ ہے جو قرآن میں بتائی گئی ہے۔ حدیث اور سیرت کی کتابیں بھی بلاشبہ آپ کی زندگی کو جاننے کا ماخذ ہیں۔ مگر اس معاملہ میں پہلا اور اصولی ماخذ بلاشبہ قرآن ہے۔ پیغمبر اسلام کی وہی تصویر درست تصویر ہے جو قرآن کے بیانات سے مطابقت رکھتی ہو۔ یہاں ہم قرآن کی کچھ آیات کی روشنی میں پیغمبر اسلام کی زندگی کا مطالعہ کرنے کی کوشش کریں گے۔

متلاشیٔ حق

قرآن کی سورہ نمبر ۹۳ میں پیغمبر اسلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ...... قسم ہے روز روشن کی۔ اور رات کی جب وہ چھا جائے۔ تمہارے رب نے تم کو نہیں چھوڑا۔ اور نہ وہ تم سے بیزار ہوا۔ اور یقیناً آخرت تمہارے لئے بہتر ہے۔ اور عنقریب اللہ تم کو دے گا۔ پھر تو راضی ہو جائے گا۔ کیا اللہ نے تم کو یتیم نہیں پایا پھر ٹھکانہ دیا۔ اور تم کو متلاشی پایا تو راہ دکھائی۔ اور تم کو نادر پایا تو تم کو غنی کر دیا۔ پس تم یتیم پر سختی نہ کرو۔ اور تم سائل کو نہ

جھڑکو۔اور تم اپنے رب کی نعمت بیان کرو(الضحیٰ ۱۱۔۱)

پیغمبر اسلام ﷺ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی۔ اس سے پہلے آپ کی جو زندگی تھی وہ قرآن کے اس بیان(ووجدك ضالاً) سے معلوم ہوتی ہے۔اس کی تشریح میں علماء کے جو اقوال تفسیر کی کتابوں میں آئے ہیں ان میں چند یہ ہیں............ ووجدك طالباً،ووجدك متحيراً،ووجدك محباً للهداية(التفسير القرطبى ٩٧/٢٠)

اس حالت کو ایک لفظ میں، تلاش حق کہا جاسکتا ہے۔ گویا کہ پیغمبر بنائے جانے سے پہلے آپ ایک متلاشیٔ حق(Truth seeker) تھے۔ آپ حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے۔اس زمانہ میں آپ بستی سے نکل کر صحرا اور پہاڑ کی طرف چلے جاتے، غار حراء کی تنہائی میں قیام فرماتے، خاموشی کے ساتھ غور وفکر میں مشغول رہتے۔ یہ سب آپ کی اسی تلاش حق کے مظاہر تھے جن کا تذکرہ حدیث اور سیرت کی کتابوں میں آیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ حق کی دریافت سے پہلے کسی آدمی کے لئے صحیح طریقہ یہ ہے کہ وہ حق کی تلاش میں ہو۔ جو آدمی فی الواقع سچائی کی تلاش میں سرگرداں ہوگا اس کو اسی طرح ہدایت ملے گی جس طرح قرآن کے مطابق، محمد ﷺ کو ملی۔ فرق صرف یہ ہے کہ آپ کو ہدایت کے ساتھ نبوت بھی دی گئی اور دوسرے انسانوں کو صرف ہدایت ملے گی۔

بشریت رسول

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ عام انسانوں کی طرح ایک انسان تھے۔ آپ کی امتیازی خصوصیت یہ نہیں تھی کہ آپ غیر بشر تھے۔ بلکہ آپ کی امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ آپ بشر ہونے کے ساتھ ایک پیغمبر بھی تھے۔اس سلسلہ میں قرآن کی چند آیتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

هل كنت الا بشرا رسولا (الاسراء)

قل انما انا بشر مثلكم يوحى الى انما الهكم اله واحد (الكهف ١١٠)

قل انما انا بشر مثلكم يوحى الیّ (حم السجدہ ٦٥)

قالت لهم رسلهم ان نحن الا بشر مثلكم (ابراهيم ١١)

ایسا ہونا بالکل فطری تھا۔ پیغمبر اسلام کو تمام انسانوں کے لئے عملی نمونہ کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ آپ لوگوں کے لئے عملی نمونہ صرف اس وقت ہو سکتے ہیں جب کہ آپ بھی دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان ہوں۔ آپ کے اندر بھی وہی احساسات ہوں جو دوسرے انسان کے اندر ہوتے ہیں۔ آپ کی فطرت کے اجزاء بھی وہی ہوں جو دوسرے انسانوں کی فطرت کے اجزا ہیں۔ آپ بھی اسی گوشت پوست کا مجموعہ ہوں جس کا مجموعہ ایک عام انسان ہوتا ہے۔ اگر یہ یکسانیت نہ ہو تو یہ حکم ایک غیر عملی حکم بن جائے گا کہ اے لوگو، تم پیغمبر خدا کے نمونہ کی پیروی کرو۔

پیغمبر اسلام کی عظمت اسی میں تھی کہ آپ بشر ہوتے ہوئے اعلیٰ اخلاق کو اپنے ذہن میں جگہ دیں۔ اعلیٰ اخلاق کو اپنا اخلاق بنائیں۔ ہر معاملہ میں اعلیٰ روش کا ثبوت دیں۔ اگر آپ غیر بشر ہوتے تو آپ کا یہ غیر معمولی کردار عظیم کردار نہیں بن سکتا تھا۔

رسول ایک آزمائش

قرآن کی سورہ نمبر ٦ میں پیغمبر کے مخالفین کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ......

اور وہ کہتے ہیں کہ اس پر کوئی فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر ہم کوئی فرشتہ اتارتے تو معاملہ کا فیصلہ ہو جاتا پھر انھیں مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم کسی فرشتہ کو رسول بنا کر بھیجتے تو اس کو بھی آدمی بناتے اور ان کو اسی شبہ میں ڈال دیتے جس میں وہ اب پڑے ہوئے

ہیں۔(الانعام ۸۔۹)

اس طرح مخالفین رسول کے تذکرہ کے تحت قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ ....
اور وہ کہتے ہیں کہ وہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا کہ وہ اس کے ساتھ رہ کر ڈراتا یا اس کے لئے کوئی خزانہ اتارا جاتا۔ یا اس کے لئے کوئی باغ ہوتا جس سے وہ کھاتا (الفرقان ۷۔۸) اسی طرح دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ .... اور جب ان کے پاس ہدایت آ گئی تو ان کو ایمان لانے سے ان کے سوا اور کوئی چیز مانع نہیں ہوئی کہ انھوں نے کہا کہ کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔ (بنی اسرائیل ۹۴)

ان آیتوں کو سمجھنے کے لئے اس اصول کو استعمال کرنا چاہئے جس کو ایک عربی مقولہ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: تعرف الاشیاء باضدادھا (چیزیں اپنے ضد سے پہچانی جاتی ہیں) اس اصول کے مطابق غور کیجئے تو پیغمبر اسلام (نیز دوسرے پیغمبروں) کی دو، ایک دوسرے کے بالکل مختلف، تصویریں ہمارے سامنے آتی ہیں۔ ایک وہ جو مذکورہ قرآنی آیتوں کے مطابق، پیغمبر کے ہم عصر مخاطبین کے سامنے تھی۔ دوسری تصویر وہ تھی جو پیغمبر اسلام کے ظہور کے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال بعد آج کے لوگوں کو دکھائی دیتی ہے۔ قدیم تصویر میں پیغمبر صرف ایک عام انسان دکھائی دیتا ہے۔ اس کے برعکس آج کی تصویر اتنی عظیم ہے کہ تذکرہ کرنے والے جب آپ کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ لغت کے آخری اور انتہائی الفاظ آپ کے لئے استعمال کرتے ہیں مثلاً فخر موجودات، شہنشاہ کونین، سرور کائنات، محسن انسانیت، تاجدار عرب، آقائے نامدار وغیرہ۔

ایک ہی شخصیت کی دو مختلف تصویر کیوں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر جب آتا ہے تو

وہ اپنے ہم عصروں کے لئے اپنے مجرد روپ میں ہوتا ہے۔ مگر سیکڑوں سال بعد ایسا ہوتا ہے کہ پیغمبر کی شخصیت کے ساتھ اس کے گرد بننے والی بعد کی تاریخ شامل ہو جاتی ہے۔ پہلی تصویر میں پیغمبر اپنی تاریخ کے بغیر ہوتا ہے، اور دوسری تصویر میں پیغمبر اپنی تاریخی عظمتوں کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ ایمان وہ معتبر ہے جو مثل صحابہ ایمان ہو۔ چنانچہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ پھر اگر وہ ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے ہو تو بیشک وہ راہ پا گئے۔ اور اگر وہ پھر جائیں تو اب وہ ضد پر ہیں۔ پس تمہاری طرف سے اللہ اس کے لئے کافی ہے اور وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے (البقرہ۔ ۱۳۷)

صحابہ ان اہل ایمان کو کہا جاتا ہے جو پیغمبر کے ہم زمانہ تھے۔ ان اہل ایمان نے پیغمبر کو اس کی ابتدائی تصویر کے ساتھ دیکھا۔ انھوں نے پیغمبر کو اس وقت پہچانا جب کہ اس کی ذات کے ساتھ تاریخ کی عظمتیں شامل نہیں ہوئی تھیں جب کہ بظاہر وہ عام انسانوں جیسا ایک انسان تھا نہ کہ وہ غیر معمولی انسان جس کو آج مذکورہ قسم کے بڑے بڑے القاب کے ساتھ بیان کیا جاتا ہے۔ پیغمبر کی پہلی تصویر ہی اس کی حقیقی تصویر ہے۔ بقیہ چیزیں مابعد تاریخ کے اضافے ہیں۔ ایمان بالرسول کا کریڈٹ صرف اس شخص کو مل سکتا ہے جو پیغمبر کو اس کے مجرد روپ میں دریافت کرے، جو تاریخ کو حذف کر کے پیغمبر کو اس کی اصل صورت میں پہچان لے۔

علم غیب

قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ غیب کا علم صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے، اللہ کے سوا کوئی غیب دانی کی صفت نہیں رکھتا جیسا کہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے: **عالم الغیب فلایظھر**

علی غیبه احداً(الجن ۲۶)

پیغمبر اسلام کے بارے میں قرآن میں بار بار صراحت کی گئی ہے کہ آپ کو علم غیب نہیں دیا گیا ہے۔ بعض مواقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل کے ذریعہ کچھ باتیں پیشگی طور پر آپ کو بتا دیں۔ مثلاً حدیبیہ کا نتیجہ فتح مبین کی صورت میں ظاہر ہونا (الفتح ۱) مگر عمومی اور ذاتی صفت کے طور پر آپ کو غیب داں نہیں بنایا گیا۔ اس سلسلہ میں قرآن کی چند آیتیں یہاں نقل کی جاتی ہیں:

ولو كنت اعلم الغيب لاستكثرت من الخير. (الاعراف ۱۸۸)

ولا اقول لكم عندى خزائن الله ولا اعلم الغيب. (هود ۳۱)

فقل انما الغيب لله فانتظروا انى معكم من المنتظرين. (يونس ۲۰)

تلك من انباء الغيب نوحيها اليك ما كنت تعلمها. (هود ۴۹)

یہ اور اس قسم کی دوسری آیتیں صراحت کے ساتھ یہ ثابت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کو غیب کا علم حاصل نہ تھا۔ پیغمبر کے لئے اللہ تعالیٰ کی سنت یہ ہے کہ اس کو وہی چیزیں دی جاتی ہیں جس کی اسے پیغمبرانہ ذمہ داری ادا کرنے کے لئے ضرورت ہو، اور اس کام کا غیب دانی سے کوئی تعلق نہیں۔

پیغمبر کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ غیب کی باتیں بتا کر لوگوں کو متحیر کرے یا اس قسم کے کارنامے دکھا کر لوگوں کے اوپر اپنی برتری قائم کرے بلکہ وہ دعوت اور نصیحت کے ذریعہ لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہی پیغمبر کا اصل کام ہے اور اس کام کے لئے غیب دانی کی کوئی شرط نہیں، اس لئے کسی پیغمبر کو غیب داں بھی نہیں بنایا گیا۔

عسر میں یسر

قرآن کی سورہ نمبر ۹۵ میں پیغمبر اسلام کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ......

کیا ہم نے تمہارا سینہ تمہارے لئے کھول نہیں دیا۔ اور تمہارا وہ بوجھ اتار دیا جس نے تمہاری پیٹھ جھکا دی تھی۔ اور ہم نے تمہارا ذکر بلند کیا۔ پس مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ بیشک مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔ پھر جب تم فارغ ہو جاؤ تو محنت کرو۔ اور اپنے رب کی طرف توجہ رکھو۔ (الانشراح ۸۔۱)

ان آیات کے ذریعہ پیغمبر اسلام کی زندگی کا ایک خاص پہلو سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کی توفیق سے اور اللہ کی رہنمائی کے تحت آپ نے اپنے اندر یہ استعداد پیدا کی کہ آپ مشکل میں آسانی کو دیکھیں۔ ناموافق حالات کو عزم وہمت کے ساتھ موافق حالات میں بدلنے کی کوشش کریں۔ مایوسی کے مواقع پر بھی امید کے ساتھ اپنا عمل جاری رکھیں۔

اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے یہاں چند مثالوں کے ذریعہ اس معاملہ کو واضح فرمایا ہے۔ مثلاً یہ کہ پیغمبر اسلام کو سختیوں کا تجربہ ہوا۔ ان سختیوں نے آپ کے ذہن کو کھولا اور آپ کو شرح صدر کی نعمت حاصل ہوئی۔ اسی طرح آپ کے مخالفین نے آپ کے خلاف طرح طرح کی غلط باتیں پھیلائیں۔ مگر عملاً یہ ہوا کہ مخالفین کا یہ پروپیگنڈہ آپ کے مشن کے لئے عمومی چرچا کا ذریعہ بن گیا وغیرہ۔

پیغمبر اسلام کے پیرووں کو اپنے اندر یہی ذہن پیدا کرنا چاہئے۔ ان کے اندر یہ صلاحیت ہونی چاہئے کہ وہ "نہیں" میں "ہے" کو دیکھیں، وہ مشکل کو آسانی میں بدل سکیں۔

رزق رب

قرآن کی سورہ نمبر ۲۰ میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے کہ ...... اور ہر گز ان چیزوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھو جن کو ہم نے ان کے کچھ گروہوں کو ان کی آزمائش کے لئے انھیں دے رکھا ہے۔ اور تمہارے رب کا رزق زیادہ بہتر ہے اور باقی رہنے والا ہے۔ اور اپنے لوگوں کو نماز کا حکم دو اور اس کے پابند رہو۔ ہم تم سے کوئی رزق نہیں مانگتے رزق تو تم کو ہم دیں گے اور بہتر انجام تو تقوی کے لئے ہی ہے۔ (طہٰ ۱۳۲۔۱۳۱)

پیغمبر اسی دنیا میں رہتا ہے جس میں عام لوگ زندگی گزارتے ہیں۔ لیکن عام انسان اس کو اپنا مقصد بنا لیتے ہیں کہ وہ دنیا کا سامان زیادہ سے زیادہ اپنے لئے اکٹھا کریں تو پیغمبر کو اس طرح زندگی گزارنا ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں رہے مگر وہ دنیا کو اپنا مقصود نہ بنائے۔ وہ دنیا سے رزق مادی کا طالب نہ ہو بلکہ وہ اسے رزق ربانی کا ذریعہ بنالے۔

دنیا میں ایک شخص ایمان اور دعوت کی زندگی اختیار کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کی زندگی مشقتوں کی زندگی بن جاتی ہے۔ دوسری طرف یہ حال ہے کہ جو لوگ اس قسم کی ذمہ داری سے آزاد ہیں وہ آرام اور راحت میں اپنے صبح شام گذارتے ہیں۔ اس صورت حال کو نمایاں کر کے شیطان آدمی کے دل میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ وہ مومن اور داعی کو متزلزل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

لیکن گہرائی سے دیکھا جائے تو اس ظاہری فرق کے آگے ایک اور فرق ہے اور وہ فرق زیادہ قابل لحاظ ہے۔ وہ فرق یہ ہے کہ دنیا پرست لوگوں کو جو چیز ملی ہے وہ محض امتحان کے لئے ہے اور سراسر وقتی ہے۔ اس کے بعد اس ابدی زندگی میں ان کے لئے کچھ نہیں۔ مومن اور داعی کو خدا سے وابستگی اختیار کرنے کے نتیجہ میں جو چیز ملتی ہے وہ تمام

دنیا کی چیزوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ وہ ہے...... اللہ کی یاد، آخرت کی فکر، عبادت اور تقویٰ کی زندگی، خدا کے بندوں کو آخرت کی پکڑ سے بچانے کے لئے فکر مند ہونا۔ یہ بھی رزق ہے۔ اور یہ زیادہ اعلیٰ رزق ہے کیوں کہ وہ آخرت میں ایسی بے حساب نعمتوں کی شکل میں آدمی کی طرف لوٹے گا جو کبھی ختم ہونے والی نہیں۔

بنیادی کام

قرآن کی سورہ نمبر ۷۴ میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے...... اے کپڑے میں لپٹنے والے، اٹھ اور لوگوں کو ڈرا۔ اور اپنے رب کی بڑائی بیان کر۔ اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔ اور گندگی کو چھوڑ دے۔ اور ایسا نہ کر کہ احسان کرے اور بہت بدلہ چاہے اور اپنے رب کے لئے صبر کر (المدثر ۷۔۱)

قرآن کی ان آیات کے مطابق، اس دنیا میں اصل پیغمبرانہ کام انذار ہے۔ یعنی آخرت میں پیش آنے والے سنگین مسئلہ سے لوگوں کو آگاہ کرنا۔ یہ کام وہی شخص کر سکتا ہے جس کا دل اللہ کی بڑائی سے لبریز ہو۔ جو اچھے اخلاق کا مالک ہو۔ جو ہر قسم کی برائی سے دور ہو۔ جو بدلہ کی امید کے بغیر نیکی کرے۔ جو دوسروں کی طرف سے پیش آنے والی تکلیفوں پر یک طرفہ صبر کر سکے۔

چار ذمہ داریاں

پیغمبر اسلام ﷺ کو دعاء ابراہیم یا دعاء خلیل کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب اپنے بیٹے اسماعیل کو ان کی ماں ہاجرہ کے ساتھ حجاز کے صحرا میں بسایا تو اس وقت ان کے لئے جو دعائیں کیں، ان میں ایک دعا یہ تھی کہ...........

اے ہمارے رب ان میں ان ہی میں کا ایک رسول اٹھا جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو

کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ بیشک تو زبردست ہے حکمت والا ہے۔
ربنا وابعث فیهم رسولاً منهم یتلوا علیهم آیٰتك ویعلمهم الکتاب والحکمة ویزیکیهم انك انت العزیز الحکیم (البقرہ ۱۲۹)

اس آیت کے مطابق، پیغمبر کا پہلا کام تلاوت آیات ہے۔ آیت کے معنی نشانی کے ہیں۔ یعنی وہ چیز جو کسی چیز کے اوپر دلیل بنے۔ انسان کی فطرت میں اور باہر کی دنیا میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کی بیشمار نشانیاں رکھ دی ہیں۔ یہ اشارات کی صورت میں ہیں۔ پیغمبر ان اشارات کو کھولتا ہے۔ وہ آدمی کو ایسی نگاہ دیتا ہے جس سے وہ ہر چیز میں اپنے رب کا جلوہ دیکھنے لگے۔ کتاب سے مراد قرآن ہے۔

نبی کا دوسرا کام یہ ہے کہ وہ اللہ کی وحی کا مہبط بنتا ہے اور اس کو خدا سے لے کر انسان تک پہنچاتا ہے۔

حکمت کا مطلب ہے بصیرت۔ جب آدمی خدا کی نشانیوں کو دیکھنے کی نظر پیدا کر لیتا ہے، جب وہ اپنے ذہن کو قرآن کی تعلیمات میں ڈھال لیتا ہے تو اس کے اندر ایک فکری روشنی جل اٹھتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ کے ہم شعور بنالیتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں اس صحیح فیصلہ تک پہنچ جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے۔

تزکیہ کا مطلب ہے کسی چیز کو غیر موافق عناصر سے پاک کر دینا تاکہ آدمی موافق فضا میں اپنے فطری کمال کو پہنچ سکے۔ نبی کی آخری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ایسے انسان تیار ہوں جن کے سینے اللہ کی عقیدت کے سوا ہر عقیدت سے خالی ہوں۔ ایسی روحیں وجود میں آئیں جو نفسیاتی پیچیدگیوں سے آزاد ہوں، ایسے افراد پیدا ہوں جو کائنات سے وہ ربانی رزق پا سکیں جو اللہ نے اپنے مومن بندوں کے لئے رکھ دیا ہے۔

یہ چار کام پیغمبر اسلام کے مشن کے چار بنیادی اجزا تھے۔ آپ کی تمام سرگرمیاں انھیں چاروں چیزوں کی تفصیل ہیں۔ آپ کے بعد آپ کی پیروی میں جو لوگ انسانیت کی اصلاح کے لئے اٹھیں، ان کو بھی انھیں خطوط پر کام کرنا ہے جن پر پیغمبر اسلام نے خدا کی رہنمائی میں کام کیا ہے۔

دعوت الی اللہ

قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اے رسول، جو کچھ تمہارے اوپر تمہارے رب کی طرف سے اترا ہے اس کو پہنچادو۔ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے اللہ کے پیغام کو نہیں پہنچایا۔ اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے گا۔ اللہ یقیناً منکر لوگوں کو راہ نہیں دیتا (المائدہ ۶۷)

اس آیت کے مطابق، پیغمبر کا اصل کام تبلیغ ماانزل اللہ تھا۔ اس کام کے بیک وقت دو پہلو تھے۔ ایک یہ کہ اس کو انجام دینا اپنے پیغمبرانہ فریضہ کو انجام دینا تھا۔ دوسرے یہ کہ یہی کام پیغمبر کے لئے لوگوں سے حفاظت کا ذریعہ بھی تھا۔

جب بھی پیغمبر اپنے ماحول میں حق کی بے آمیز دعوت پیش کرتا ہے تو اس کو مخاطبین کی طرف سے سخت رد عمل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ رد عمل موجودہ اصطلاح میں سیکولر لوگوں کی طرف سے پیش نہیں آتا، بلکہ بیشتر حالت میں وہ ان لوگوں کی طرف سے پیش آتا ہے جو مذہب کے نام پر اپنی پیشوائی اور قیادت قائم کئے ہوئے ہوں۔

مخاطبین کی طرف سے یہ رد عمل ایک فطری چیز ہے کیوں کہ پیغمبر کی بے آمیز دعوت ان لوگوں کو بے اعتبار ثابت کرنے کے ہم معنی ہوتی ہے جو خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر کھڑے ہوئے ہوں۔ داعیٔ حق کو بہر حال اس صورت حال سے سابقہ پیش آتا ہے۔ مگر

اس کا اثر اسی دائرہ تک محدود رہتا ہے جتنا خدا کے قانونِ آزمائش کا تقاضا ہے۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ مخالفین اس حد تک قابو یافتہ ہو جائیں کہ وہ دعوتی مہم کو روک دیں یا اس کو اپنی تکمیل تک پہنچنے نہ دیں۔ ایک سچی دعوت کا اپنے دعوتی نشانہ تک پہنچنا ایک خدائی منصوبہ ہوتا ہے اس لئے وہ لازماً پورا ہو کر رہتا ہے۔ اس کے بعد مدعو گروہ کا ماننا اس کی اپنی ذمہ داری ہے جو اسی کے بقدر نتیجہ خیز ہوتی ہے جتنا مدعو خود چاہتا ہے۔

یکطرفہ خیر خواہی

احد کی جنگ (۳ھ) میں مخالفین اسلام کی تعداد غیر متناسب طور پر زیادہ تھی۔ چنانچہ اس جنگ میں مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔ خود پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا کہ مخالف لشکر کی طرف سے آپ کو پتھر مارے گئے۔ آپ زخمی ہو کر لہولہان ہو گئے۔ اس نازک موقع پر آپ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: کیف یفلح قوم فعلوا ھذا بنبیھم وھو یدعو ھم الی ربھم عزوجل۔ یعنی وہ لوگ کیسے فلاح پائیں گے جنھوں نے اپنے نبی کے ساتھ ایسا سلوک کیا، حالانکہ وہ ان کو ان کے رب کی طرف بلا رہا ہے (تفسیر ابن کثیر ۱/ ۴۰۳)

یہ پیغمبر کے ساتھ ایک کھلا ہوا ظلم کا واقعہ تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند نہیں آئی۔ چنانچہ اسی وقت جبریل خدا کی طرف سے یہ آیت لے کر نازل ہوئے: لیس لک من الا مر شئی او یتوب علیھم او یعذبھم فانھم ظالمون۔

تم کو اس امر میں کوئی دخل نہیں۔ اللہ ان کی توبہ قبول کرے یا ان کو عذاب دے، کیوں کہ وہ ظالم ہیں (آل عمران ۱۲۸)

اس کے مطابق، پیغمبر کے لئے لازم ہوتا ہے کہ وہ جن لوگوں کو حق کی دعوت دے

رہا ہے ان کا وہ یکطرفہ طور پر خیر خواہ بنے یہاں تک کہ اگر وہ اس کو اپنے ظلم وزیادتی کا شکار بنائیں تب بھی وہ یکطرفہ طور پر ان کا ہمدرد و خیر خواہ بنا رہے۔ وہ پتھر مارنے والوں کے حق میں دعائیں دے۔ وہ سرکشی کرنے والوں کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے۔ وہ نفرت کرنے والوں کے ساتھ شفقت و محبت کے ساتھ پیش آئے۔ مدعو کے انجام کو خدا پر ڈالتے ہوئے آخر وقت تک وہ ان کی نصیحت کرتا رہے۔

پیغمبر کا یہی نمونہ ہر داعی کو اپنے مدعو کے ساتھ اختیار کرنا ہے۔ اس کے سوا کوئی اور روش کسی داعی حق کے لئے جائز نہیں۔

مثبت رد عمل

قرآن میں پیغمبر اسلام کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ -------اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ بلاؤ اور ان سے اچھے طریقہ سے بحث کرو۔ بے شک تمہارا رب خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکا ہوا ہے اور وہ ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر چلنے والے ہیں (النحل ۱۲۵)

اسی طرح دوسری جگہ قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ -----۔ اور اس سے بہتر کس کی بات ہوگی جس نے اللہ کی طرف بلایا اور نیک عمل کیا اور کہا کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا (حٰم السجدہ ۳۳۔۳۴)

ان دونوں آیتوں سے پیغمبر اسلام کا داعیانہ کردار معلوم ہوتا ہے۔ دعوت کا پیغام ایک قول احسن ہے۔ اپنی نوعیت کے اعتبار سے وہ ایک ایسا کلام ہے جس میں انسان کے لئے

رحمت کے سوااور کچھ نہیں۔ لیکن دعوت کا تقاضایہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنی غلطیوں کی اصلاح کرے، وہ ایک زندگی کو چھوڑ کر دوسری زندگی کو اختیار کرے، اپنی ذاتی زندگی میں اس قسم کی تبدیلی عام طور پر انسان کے لئے بہت مشکل ہوتی ہے۔اس لئے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مدعو کی طرف سے داعی کو برے سلوک کا تجربہ کرنا پڑتا ہے۔

ایسے حالات میں داعی اگر برے سلوک کے جواب میں خود بھی براسلوک کرے تو داعی اور مدعو کے درمیان وہ معتدل فضا ختم ہو جائے گی جو دعوتی عمل کے لئے ضروری ہے۔اس لئے پیغمبر کو حکم دیا گیا کہ لوگوں کے برے سلوک کے جواب میں تم اچھاسلوک کرو۔اس طرح دعوتی فضا برقرار رہے گی اور آخر کار وہ وقت آئے گا جب کہ تمہاری بات لوگوں کے دلوں میں اترے، حتی کہ مخالفین بھی تمہارے ساتھی اور موافق بن جائیں۔

ان آیتوں سے پیغمبر کی جو تصویر معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پیغمبر کا طریقہ یکطرفہ حسن کردار کا طریقہ تھا۔ پیغمبر کی نگاہ کسی آدمی کے حال پر نہیں بلکہ اس کے مستقبل پر ہوتی تھی، کوئی شخص اگر پیغمبر کے ساتھ برارویہ اختیار کرے تو پیغمبر اس کو نظر انداز کرتا تھا، اس کو یقین ہوتا تھا کہ اس کا مخاطب آخر کار حق کی اہمیت کو سمجھے گا اور اس کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائے گا۔ پیغمبر کی نظر میں دشمن بھی دوست ہوتا ہے، پیغمبر کو اپنا آج کا مخالف کل کا موافق دکھائی دیتا ہے۔

صابرانہ کردار

قران کی سورہ نمبر ۴۶ میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے-----پس تم صبر کرو جس طرح ہمت والے پیغمبروں نے صبر کیا۔اور ان کے لئے جلدی نہ کرو۔جس دن یہ لوگ اس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ ہے تو گویا وہ دن کی ایک گھڑی سے

زیادہ نہیں رہے۔ یہ پہنچا دینا ہے۔ پس وہی لوگ برباد ہوں گے جو نافرمانی کرنے والے ہیں (الاحقاف ۳۵)

پیغمبر کے کردار کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو صبر ہے۔ حق کی دعوت دینے والے کو ہمیشہ صبر کی زمین پر کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ صبر دراصل اس کا نام ہے کہ مدعو کی ایذارسانیوں کو داعی یک طرفہ طور پر نظر انداز کرے۔ وہ مدعو کے ضد اور انکار کے باوجود مسلسل اس کو دعوت پہنچاتا رہے۔ داعی اپنے مدعو کا ہر حال میں خیر خواہ بنا رہے۔ خواہ مدعو کی طرف سے اس کو کتنی ہی زیادہ ناخوش گواریوں کا تجربہ کیوں نہ ہو رہا ہو۔ یہ یکطرفہ صبر اس لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر مدعو کے اوپر خدا کی حجت تمام نہیں ہوتی۔

خدا کے تمام پیغمبروں نے ہر زمانہ میں اسی طرح صبر واستقامت کے ساتھ دعوت حق کا کام کیا۔ آئندہ بھی پیغمبروں کی نیابت میں جو لوگ دعوت حق کا کام کریں ان کو اسی نمونہ پر دعوت کا کام کرنا ہے۔ خدا کے یہاں داعی کا مقام صرف انھیں لوگوں کے لئے مقدر ہے جو یک طرفہ برداشت کا حوصلہ دکھا سکیں۔

پیغمبر کی شخصیت

قرآن کی سورہ نمبر ۹ میں پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ ------

تمہارے پاس ایک رسول آیا ہے جو خود تم میں سے ہے۔ تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق ہے۔ وہ تمہاری بھلائی کا حریص ہے۔ ایمان والوں پر نہایت شفیق اور مہربان ہے۔ پھر بھی اگر وہ منہ پھیریں تو کہہ دو کہ اللہ میرے لئے کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اس پر میں نے بھروسہ کیا۔ اور وہی مالک ہے عرش عظیم کا (التوبہ ۱۲۹۔۱۲۸)

اس آیت میں رسول اللہ ﷺ کی یہ تصویر بتائی گئی ہے کہ اسلام کی جدوجہد میں ان

کا سارا اعتماد صرف ایک اللہ پر ہے۔ وہ لوگوں کو جس خدا کی طرف بلانے کے لئے اٹھے ہیں وہ ایسا خدا ہے جو سارے اقتدار کا مالک ہے۔ تمام خزانوں کی کنجیاں اس کے پاس ہیں۔ رسول اسی ایمان ویقین کی زمین پر کھڑا ہوا ہے۔ اس لئے بالکل فطری ہے کہ اس کا سارا بھروسہ صرف ایک خدا پر ہو۔ وہ ہر قسم کی مصلحتوں اور اندیشوں سے بے پرواہو کر حق کی خدمت میں لگا رہے۔

پھر یہ بتایا کہ خدا کا رسول لوگوں کے حق میں حد درجہ شفیق اور مہربان ہے۔ وہ دوسروں کی تکلیفوں پر اس طرح کڑھتا ہے جیسے کہ وہ تکلیف خود اس کے اوپر پڑی ہو۔ وہ حرص کی حد تک لوگوں کی ہدایت کا طالب ہے۔ دعوت حق کی جدوجہد کے لئے اس کو جس چیز نے متحرک کیا ہے وہ سراسر خیر خواہی کا جذبہ ہے نہ کہ کوئی شخصی حوصلہ یا قومی مسئلہ کا۔ وہ خود لوگوں کی بھلائی کے لئے اٹھا ہے نہ کہ اپنی کسی ذاتی غرض کے لئے۔

عبد اللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: لوگ پروانوں کی طرح آگ میں گر رہے ہیں اور میں ان کی کمر پکڑ کر ان کو آگ میں گرنے سے روک رہا ہوں (الا انی آخذ بحجز کم ان تهافتوا فی النار کتهافت الفراش والذباب) مسند احمد

رسول کی اس تصویر کی شکل میں حق کے داعی کی تصویر ہمیشہ کے لئے بتادی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے داعی کے اندر دو خاص صفات نمایاں طور پر ہونی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اس کا بھروسہ ایک اللہ پر ہو۔ دوسرے یہ کہ مدعو کے لئے اس کے دل میں صرف محبت اور خیر خواہی کا جذبہ ہو، اس کے سوا اور کچھ نہ ہو۔ اگر چہ مدعو کی طرف سے طرح طرح کی شکایتیں پیش آتی ہیں۔ اس کے اور داعی کے درمیان قومی اور مادی جھگڑے بھی ہو سکتے ہیں۔ ان سب کے باوجود یہ مطلوب ہے کہ داعی ان تمام چیزوں کو

نظر انداز کرے اور مدعو کے لئے رحمت اور خیر خواہی کے سوا کوئی جذبہ اپنے اندر پیدا نہ ہونے دے۔

داعی کو ردِ عمل کی نفسیات سے بلند ہونا پڑتا ہے۔ اس کو یک طرفہ طور پر ایسا کرنا پڑتا ہے کہ وہ مدعو کا خیر خواہ بنے، خواہ مدعو نے اس کے خلاف کتنا ہی زیادہ قابل شکایت رویہ کیوں نہ اختیار کیا ہو۔ داعی خدا کے لئے جیتا ہے اور مدعو اپنی ذات کے لئے۔

پیغمبر اسلام کی شخصیت

مثبت مزاج

پیغمبر اسلام کا مربی اللہ تعالیٰ تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس سلسلہ میں مختلف مواقع پر جو رہنمائی اتری ان میں سے ایک وہ تھی جس کو مثبت مزاج کی تعمیر کہا جا سکتا ہے۔ موجودہ دنیا میں ہر ایک کے ساتھ ایسے واقعات پیش آتے ہیں جو بظاہر ناخوشگوار دکھائی دیتے ہیں۔ پیغمبر اسلام کی زندگی میں بھی بار بار ایسے واقعات پیش آئے۔ ایسے مواقع پر ہر بار اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ رہنمائی دی گئی کہ بظاہر ایک غیر موافق واقعہ میں بھی کس طرح موافق پہلو چھپا ہوا ہے۔

قدیم مکہ میں جب پیغمبر اسلام نے اپنی دعوت توحید کا آغاز کیا تو وہاں سخت قسم کی مشکلات پیش آئیں۔ اس وقت قرآن میں یہ رہنمائی دی گئی کہ مشکلات سے نہ گھبراؤ، کیوں کہ اس دنیا میں ہر مشکل کے ساتھ آسانی موجود ہوتی ہے (الانشراح ۵) اسی طرح آپ کے مشن کے بارے میں آپ کے مخالفین نے بڑے پیمانے پر جھوٹا پروپیگنڈا شروع کیا۔ آپ پر طرح طرح کے عیب اور الزام لگائے گئے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ رہنمائی اتری کہ اس پروپیگنڈے کے ذریعہ تمہارا چرچا ہر طرف پھیل رہا ہے۔ اس لئے اس کو مخالفانہ پروپیگنڈا نہ سمجھو بلکہ اس کو اپنا اور اپنے مشن کا رفع ذکر سمجھو (الانشراح ۴) تقریباً ۲۰ سال تک تبلیغ کرنے کے باوجود آپ اور آپ کے ساتھی عرب میں اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اور مشرکین اکثریت میں تھے۔ اس وقت آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو فطرت کا ایک قانون یاد دلاتے ہوئے کہا گیا کہ اس دنیا میں کتنی ہی بار ایسا ہوا ہے کہ عددی

اقلیت رکھنے والا گروہ عددی اکثریت کے اوپر غالب آیا۔ (البقرہ ۲۴۹)

اسی طرح ۳ھ میں غزوہ احد پیش آیا۔ اس میں مسلمانوں کو مشرکین کے مقابلہ میں شکست ہوئی۔ یہ بظاہر ایک دل شکن واقعہ تھا۔ مگر اس وقت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو رہنما آیتیں اتریں وہ دوبارہ اس کے روشن پہلو کی طرف نشاندہی کرنے والی تھیں۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ احد کی جنگ میں اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو اس سے پہلے بدر کی جنگ میں مشرکین کو زخم پہنچ چکا ہے۔ اور ہم ان ایام کو لوگوں کے درمیان بدلتے رہتے ہیں (آل عمران ۱۴۰)

اسی طرح ٦ھ میں پیغمبر اسلام اور مشرکین کے درمیان وہ واقعہ پیش آیا جس کو صلح حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ یہ صلح بظاہر مسلمانوں کی سیاسی شکست کے ہم معنی تھی۔ مگر قرآن میں جب اس پر تبصرہ کیا گیا تو برعکس طور پر اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا کہ ہم نے تم کو تمہارے حریف کے اوپر کھلی فتح دے دی (الفتح ۱) اس کا مطلب یہ تھا کہ بظاہر سیاسی شکست کے باوجود اس معاملہ میں تم کو اخلاقی فتح حاصل ہوئی ہے۔ جو آخر کار مکمل فتح بننے والی ہے۔ وغیرہ۔

اس خدائی تربیت نے پیغمبر اسلام کو ایک ایسا انسان بنادیا جو منفی طرز فکر سے مکمل طور پر خالی تھا۔ آپ مثبت فکر میں اتنا زیادہ بڑھے ہوئے تھے کہ بلاشبہ آپ کو دنیا کا سب سے بڑا مثبت مفکر (positive thinker) کہا جا سکتا ہے۔

اللہ پر اعتماد

ہجرت کے سفر میں جب پیغمبر اسلام مکہ سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے تو اس وقت آپ کے ساتھ صرف حضرت ابو بکر صدیق تھے۔ یہ بے حد نازک سفر تھا۔ مکہ کے لوگ آپ کے جانی دشمن تھے۔ یہ یقینی تھا کہ وہ آپ کا پیچھا کریں گے۔ چنانچہ آپ نے شدید

احتیاط کے ساتھ یہ سفر فرمایا۔ حتی کہ آپ کو مکہ سے مدینہ کی طرف جانا تھا لیکن آپ الٹے رخ پر چل کر غار ثور میں پہنچے اور وہاں حضرت ابو بکر صدیق کے ساتھ چھپ کر چند دن قیام کیا۔

مکہ کے سرداروں کو جب آپ کی ہجرت کی خبر ہوئی تو انھوں نے اپنے آدمیوں کو چاروں طرف دوڑایا تاکہ آپ کو مدینہ پہنچنے سے پہلے پکڑ لیں۔ اور نعوذ باللہ آپ کو قتل کر ڈالیں۔ آپ ابھی غار ثور میں چھپے ہوئے تھے کہ مکہ کے کئی لوگ آپ کی تلاش میں وہاں پہنچ گئے۔ اس وقت وہ اتنے قریب تھے کہ غار کے اندر سے وہ صاف نظر آرہے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق نے جب یہ دیکھا کہ تلوار لئے ہوئے یہ لوگ غار کے منہ تک پہنچ گئے ہیں تو انھوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول، اگر ان میں سے کوئی اپنے پاؤں کی طرف نظر ڈالے تو وہ ضرور ہم کو دیکھ لے گا۔ یہ سن کر پیغمبر اسلام نے کامل اعتماد کے ساتھ فرمایا: یا ابا بکر ما ظنك باثنين الله ثالثهما (سیرت ابن کثیر ۲/ ۲۴۳) یعنی اے ابو بکر، ان دو کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے جن کا تیسرا اللہ ہو۔

پیغمبر اسلام کی زبان سے نکلا ہوا یہ کلمہ اتنا عظیم ہے کہ شاید پوری انسانی تاریخ میں اس کی کوئی دوسری نظیر موجود نہیں۔ اس وقت آپ بلاشبہ انتہائی پر خطر حالات میں تھے۔ لیکن اللہ پر اعتماد اتنا زیادہ بڑھا ہوا تھا کہ کوئی بھی طوفان اس کو متزلزل نہیں کر سکتا تھا۔ یہی بے پناہ اعتماد تھا جس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ ایسے پر خوف حالات میں اتنا زیادہ بے خوفی کا کلمہ آپ کی زبان سے نکلے۔

عبادت کی کیفیت

پیغمبر اسلام روزانہ خدا کی عبادت کرتے تھے دن کو بھی اور رات کو بھی۔ عبادت

کے وقت آپ کے دل کی جو کیفیت ہوتی تھی اس کا اندازہ ایک روایت سے ہوتا ہے۔ حضرت علی بتاتے ہیں کہ جب آپ نماز کے لئے کھڑے ہوتے تو اس میں ذکر و دعا کے کون سے الفاظ آپ کی زبان پر جاری ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں وہ بتاتے ہیں کہ جب آپ نماز کے وقت رکوع میں جھکتے تھے تو آپ کی زبان پر یہ الفاظ ہوتے تھے: اللهم لك ركعت وبك آمنت خشع لك سمعي وبصري مخي وعظمي وعصبي (اے اللہ میں تیرے آگے جھک گیا، اور میں تجھ پر ایمان لایا، اور میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالہ کیا، تیرے آگے جھک گئے میرے کان، اور میری آنکھ، اور میرا دماغ اور میری ہڈیاں اور میرے اعصاب)

اسی طرح حضرت علی بتاتے ہیں کہ پیغمبر اسلام جب سجدہ کے وقت زمین پر اپنا سر رکھتے تھے تو اس وقت آپ کی زبان پر یہ الفاظ جاری ہو جاتے تھے: اللهم لك سجدت، وبك آمنت ولك اسلمت، سجد وجهي للذي خلقه وشق سمعه وبصره تبارك الله احسن الخالقين (اے اللہ میں نے تیرے لئے سجدہ کیا، اور میں تجھ پر ایمان لایا، اور میں نے اپنے آپ کو تیرے حوالہ کیا، میرا چہرہ اس کے آگے جھک گیا جس نے اس کو پیدا کیا اور اس کی صورت گری کی اور اس کے کان اور آنکھ کو بنایا۔ پس بابرکت ہے اللہ، سب سے بہتر تخلیق کرنے والا) صحیح مسلم بحوالہ مشکاۃ المصابیح جلد اول صفحہ ۲۵۷

اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام جب عبادت میں مشغول ہوتے تھے تو اس وقت ان کے جذبات کیا ہوتے تھے۔ اس وقت وہ خدا کی عظمت و ہیبت کے احساس میں ڈوبے ہوئے ہوتے تھے۔ خدا کی برتری اور اس کے مقابلہ میں اپنے عجز کا تصور ان کے سینہ میں ایک طوفان کی حیثیت اختیار کر لیتا تھا۔ ان کی عبادت ان کے لئے خدائے عظیم

وکبیر کے سامنے حاضری کے ہم معنی بن جاتی تھی۔ آپ کی عبادت آپ کے لئے انتہائی حد تک ایک زندہ عمل تھی نہ کہ محض کچھ رسمی اعمال کی ادائیگی۔

ہدایت کے لئے تڑپنا

قرآن کی سورہ نمبر ۲۶ میں پیغمبر کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ---- یہ واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ شاید تم اپنے کو ہلاک کر ڈالوگے اس پر کہ وہ ایمان نہیں لاتے۔ اگر ہم چاہیں تو تم پر آسمان سے نشانی اتار دیں۔ پھر ان کی گردنیں اس کے آگے جھک جائیں (الشعراء ا۔۴)

یہ اور اس طرح کی دوسری شہادتیں بتاتی ہیں کہ پیغمبر اسلام اپنے مخاطبین کی ہدایت کے لئے کتنا زیادہ حریص تھے۔ "شاید تم اپنے آپ کو ہلاک کرلوگے" کا جملہ اس کامل خیر خواہی کو بتا رہا ہے جو پیغمبر اسلام کو اپنے مخاطبین کے حق میں تھی۔ دعوتی عمل خالص خیر خواہی کے جذبہ سے ابلتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اسی کامل خیر خواہی کے تحت اپنی قوم کو حق کی دعوت پہنچائی۔ اور آپ نے اپنی تمام کوششیں اس کی راہ میں صرف کر دیں۔ اس کے باوجود ان کی اکثریت آپ کے پیغام کو ماننے پر راضی نہ ہوئی۔ اس کے بعد آپ کا حال یہ ہوا کہ آپ ان کی ہدایت کے غم میں ہلکان ہونے لگے۔ آپ کے دن کا چین رخصت ہو گیا اور آپ کی رات کی نیند غائب ہو گئی۔

لعلک باخع النفسک (شاید تم اپنے آپ کو ہلاک کرلوگے) کا مطلب آپ کو اس سے روکنا نہیں ہے۔ بلکہ یہ اس بات کی تصدیق ہے کہ آپ نے اپنی پیغمبرانہ ذمہ داری کو اس کی آخری اور انتہائی حد تک ادا کر دیا۔ دوسرے کی ہدایت کے لئے اپنے آپ کو ہلکان کرنا، پیغمبر کی شخصیت کا اہم ترین وصف ہے۔ اس وصف میں آپ بلاشبہ کمال کے درجہ کو پہنچے ہوئے تھے

کیفیات کی حفاظت

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے پیش کش کی کہ وہ مکہ کی وادی کو میرے لئے سونا بنادے۔ میں نے کہا کہ اے میرے رب نہیں۔ بلکہ میں چاہتاہوں کہ میں ایک دن سیر ہو کر کھاؤں اور ایک دن بھوکا رہوں۔ پھر جب مجھے بھوک لگے تو میں تجھ سے تضرع کروں اور تجھ کو یاد کروں۔ اور جب میں شکم سیر ہوں تو تیری حمد کروں اور تیرا شکر کروں۔

عرض ربی لیجعل لی بطحاء مكة ذهبا فقلت لا یارب ولکن اشبع یوما واجوع یوما فاذا جعت تضرعت اليك وذكرتك واذا شبعت حمدتك وشكرتك

(احمدو الترمذی بحواله مشكاة المصابيح ۱٤٣٣/٣

کیفیات کا تعلق حالات سے ہے۔ انسان جس قسم کے حالات میں ہو ویسی ہی کیفیات اس کے اندر پیدا ہوتی ہیں۔ پیغمبر اسلام بھی قرآن کے مطابق، ایک بشر تھے۔ اس لئے آپ بالقصد یہ اہتمام فرماتے تھے کہ آپ ان حالات سے گذریں جو انسان کے اندر مطلوب ربانی کیفیات پیدا کرنے والے ہیں۔ اسی لئے آپ نے اس کو پسند نہیں کیا کہ آپ ہمیشہ آرام اور خوشی کی حالت میں رہیں۔ اس کے برعکس آپ نے اس کا اہتمام فرمایا کہ آپ پر سخت حالات بھی گذریں تاکہ اس کے اثر سے آپ کے اندر انابت اور تضرع کی کیفیت پیدا ہو۔ اسی طرح آپ پر اچھے حالات بھی گذریں تاکہ اس کے اثر سے آپ کے اندر حمد اور شکر کے جذبات ابھریں۔

شجاعت و بے خوفی

۸ھ میں وہ غزوہ پیش آیا جس کو غزوہ حنین کہا جاتا ہے۔ پیغمبر اسلام بھی اس غزوہ

میں موجود تھے۔ اس غزوہ میں ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام اپنے اصحاب کے ساتھ ایک سفر طے کر رہے تھے۔ اچانک قبیلۂ ہوازن نے کسی اشتعال کے بغیر تیروں کے ذریعہ ان پر حملہ کر دیا۔ اس اچانک حملہ کی وجہ سے مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ بیشتر لوگ ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ تاہم پیغمبر اسلام اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ اپنی جگہ بے خوفی کے ساتھ قائم رہے۔ اس وقت ہر طرف سے تیر آ رہے تھے۔ لیکن آپ اپنے خچر کے اوپر بیٹھے ہوئے یہ شعر پڑھ رہے تھے:

انا النبی لا کذب　　　انا ابن عبد المطلب

یعنی میں خدا کا پیغمبر ہوں، اس میں کوئی جھوٹ نہیں۔ میں عبد المطلب کا بیٹا ہوں

(السیرۃ النبویۃلابن کثیر ، المجلد الثالث ، ۶۲۳)

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام شجاعت و بہادری میں کمال درجہ پر تھے۔ ان کا سینہ خوف سے مکمل طور پر خالی تھا۔ تیروں کی بارش بھی ان کے اندر کوئی تزلزل پیدا نہیں کر سکتی تھی۔ اپنی صداقت کے یقین نے انھیں آخری حد تک ناقابل تسخیر بنا دیا تھا۔

راحت نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ کی ایک حدیث ہے۔ اس میں آپ نے فرمایا کہ: میں وہ دیکھتا ہوں جو تم نہیں دیکھتے اور میں وہ سنتا ہوں جو تم نہیں سنتے۔ آسمان چرچرا رہا ہے اور اس کے لئے سزاوار ہے کہ وہ چرچرائے۔ اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ آسمان میں چار انگل جگہ بھی نہیں جہاں ایک فرشتہ اپنی پیشانی جھکائے ہوئے سر بسجود نہ ہو۔ خدا کی قسم اگر تم وہ جانتے جو میں جانتا ہوں تو تم ہنستے کم اور روتے زیادہ۔ عورتوں کے ساتھ بستروں پر تمہارے لئے کوئی لذت نہ رہتی۔ اور تم اللہ کو پکارتے ہوئے پہاڑوں کی طرف نکل جاتے۔

حدیث کے راوی ابوذر کہتے ہیں کہ کاش میں ایک درخت ہوتا جو کاٹ دیا جاتا۔ (احمد، الترمذی، ابن ماجہ بحوالہ مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۶۹)

یہ بظاہر دوسروں سے خطاب ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ حدیث خود پیغمبر اسلام کی اپنی نفسیاتی حالت کی تصویر ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے روزوشب کن احساسات میں بسر ہوتے تھے۔ ان کا ذہن کس قسم کی باتیں سوچتا تھا۔ ان کے پاس وہ سب سے بڑی خبر کیا تھی جس کو دوسروں تک پہنچانے کے لئے وہ بیقرار رہتے تھے۔

قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام کو خدا نے یہ مشن سپرد کیا تھا کہ وہ انسان کو زندگی کی حقیقت بتائیں اور موت کے بعد سامنے آنے والی ہولناکیوں سے باخبر کریں۔ ایسے ایک انسان کے لئے دنیا راحت اور مسرت کی جگہ نہیں ہوسکتی۔ وہ ان چیزوں میں لذت نہیں لے سکتا جس میں بے خبر لوگ لذت محسوس کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے بارے میں روایات میں آتا ہے کہ آپ مسلسل غم اور فکر میں مبتلا رہتے تھے (كان متوالى الا حزان دائم الفكرة)

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۲۵ سال کی عمر میں عرب کی ایک نیک بخت خاتون خدیجہ سے نکاح کیا۔ ان کے ساتھ آپ ایک پر مسرت ازدواجی زندگی گزار رہے تھے۔ یہاں تک کہ ۴۰ سال کی عمر میں آپ کو نبوت ملی۔ اس کے بعد گھر میں آئے تو آپ کی اہلیہ نے حسب معمول آپ کے لئے بستر بچھایا اور کہا کہ آپ یہاں آرام کیجئے۔ پیغمبر اسلام نے فرمایا کہ اے خدیجہ اب آرام کہاں۔ (اين الراحة يا خديجة)

برابری کا احساس

پیغمبر اسلام کے ایک صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ غزوہ بدر کے سفر

میں ہم لوگ نکلے تو ہمارے پاس سواری کے لئے اونٹ بہت کم تھے۔ چنانچہ ایک اونٹ پر باری باری تین آدمی سوار ہوتے تھے۔ علی بن ابی طالب اور ابولبابہ رسول اللہ کے ساتھ ایک اونٹ میں شریک تھے۔ پھر جب رسول اللہ کی باری نہ ہوتی تو وہ دونوں کہتے کہ اے خدا کے رسول آپ اونٹ پر سوار ہو جائیں۔ ہم آپ کے بدلے چلیں گے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ فرماتے کہ تم چلنے میں مجھ سے زیادہ طاقتور نہیں ہو اور میں تم دونوں سے کم اجر کا حاجت مند نہیں ہوں ۔(ما ا نتما باقویٰ علی المشی منی وما انا باغنی عن الاجر منکما) مسند الامام احمد بن حنبل ۱/۴۲۲

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ جب لوگوں کے درمیان ہوتے تھے تو اس وقت ان کے احساسات کیا ہوتے تھے۔ پیغمبر ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کی طرح ایک انسان سمجھتے تھے۔ ان کا احساس یہ ہوتا تھا کہ جس طرح دوسرے لوگوں کو اجر وثواب کی ضرورت ہے اسی طرح مجھے بھی اجر وثواب کی ضرورت ہے۔ اس کے لئے جس طرح دوسروں کو عمل کرنا چاہئے اسی طرح مجھے بھی اس کے لئے عمل کرنا چاہئے۔ وہ فخر یا برتری کے احساس سے آخری حد تک خالی تھے اور یہ سب حقیقی طور پر تھا نہ کہ مصنوعی طور پر۔

جس آدمی کو خدا کی حقیقی معرفت حاصل ہو جائے، اس کا حال ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ خدا کی معرفت جب کسی کو حاصل ہوتی ہے تو وہ اس کو انسان اصل (man cut to size) بنا دیتی ہے۔ خدا کی بے پناہ عظمتوں کا ادراک اس سے ہر قسم کی بڑائی کا احساس چھین لیتا ہے۔ خدا کے مقابلہ میں چھوٹا ہونے کا احساس اس پر اتنا زیادہ طاری ہوتا ہے کہ بظاہر بڑا ہونے کے باوجود وہ اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھ پاتا۔ خدائے برتر کی گہری معرفت اس سے ہر

قسم کی بڑائی کا احساس چھین لیتی ہے۔ وہ اپنے آپ کو صرف بندہ سمجھتا ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

پیغمبر اسلام ان احساسات میں کامل درجہ پر تھے، اس لئے بندگی کا احساس بھی ان کے اندر کامل درجہ میں پایا جاتا تھا۔

آخرت کی فکر

ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ایک بار اپنی ایک اہلیہ کے مکان میں تھے۔ ان کے یہاں ایک خادمہ تھی۔ آپ نے کسی فوری ضرورت کے تحت خادمہ کو باہر بھیجا۔ اس نے آنے میں دیر کی۔ معلوم ہوا کہ وہ راستہ میں بچوں کا کھیل دیکھنے کے لئے کھڑی ہو گئی تھی۔ خادمہ جب تاخیر کے ساتھ واپس آئی تو اس کو دیکھ کر آپ کے چہرے پر غصہ کے آثار ظاہر ہو گئے۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں ایک مسواک تھی۔ آپ نے خادمہ سے کہا: لولا خشية القود لاوجعتك بهذا السواك (اگر قیامت میں بدلہ کا ڈر نہ ہوتا تو میں تم کو اس مسواک سے مارتا)

پیغمبر اسلام لوگوں کو قیامت کی پکڑ سے ڈراتے تھے۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ڈرانا یکطرفہ نہ تھا۔ آپ جس طرح دوسروں کو آنے والی قیامت سے ڈراتے تھے اسی طرح آپ خود بھی اس سے ڈر محسوس کرتے تھے۔ آپ چاہتے تھے کہ لوگ دنیا میں اس طرح رہیں کہ ان کے دل میں خدا کی پکڑ کا خوف سمایا ہوا ہو۔ یہی خود آپ کی اپنی حالت بھی تھی۔ آپ آنے والی قیامت کو اپنے سمیت ہر ایک کا مسئلہ سمجھتے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ آپ کا پیغمبر ہونا آپ کو اخروی مسئولیت سے بے نیاز بنا دے۔

انسان کا احترام

قدیم مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ کچھ یہودی قبیلے بھی آباد تھے۔ایک دن ایسا ہوا کہ پیغمبر اسلام مدینہ کے ایک مقام پر تھے۔اس وقت وہاں سے ایک جنازہ گزرا۔ آپ اس وقت بیٹھے ہوئے تھے۔جنازہ کو دیکھ کر آپ اس کے احترام میں کھڑے ہوگئے۔اس وقت آپ کے کچھ صحابہ بھی آپ کے ساتھ تھے۔یہ دیکھ کر ایک صحابی نے کہا کہ اے خدا کے رسول یہ تو ایک یہودی کا جنازہ تھا۔یہ سن کر آپ نے فرمایا: الیست نفسا (کیا وہ انسان نہ تھا) صحیح البخاری، کتاب الجنائز، بحوالہ فتح الباری، جلد ۳ ص، ۲۱۴۔

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے دل میں دوسرے انسانوں کے بارے میں کس قسم کے جذبات ہوتے تھے۔آپ ہر انسان کو انسان سمجھتے تھے۔ہر انسان آپ کو قابل احترام نظر آتا تھا، خواہ وہ کسی بھی قوم یا ملت سے تعلق رکھتا ہو۔ہر انسان کو آپ خدا کی ایک مخلوق سمجھتے تھے۔ہر انسان کے اندر آپ کو وہی کاریگری دکھائی دیتی تھی جو آپ کو خود اپنے وجود میں دکھائی دیتی تھی۔انسان کو دیکھ کر آپ انسان کے خالق کو یاد کرنے لگتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کے دل میں ہر انسان کے لئے محبت اور احترام کا جذبہ تھا۔انسان سے نفرت کرنا آپ کے مزاج کے بالکل خلاف تھا۔

جذبۂ انسانیت

صحیح البخاری اور صحیح مسلم میں پیغمبر اسلام کا ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے۔آپ نے مدینہ کے ایک تاجر سے کچھ قرض لیا۔بعد کو وہ اپنا قرض مانگنے کے لئے آپ کے پاس آیا۔گفتگو میں اس نے تلخی اور شدت اختیار کی۔یہاں تک کہ اس نے یہ کہا کہ عبدالمطلب کے خاندان کے لوگ سب کے سب نادہند ہوتے ہیں۔تاجر کی اس قسم کی گفتگو سن کر

صحابہ کو غصہ آگیا۔ انھوں نے چاہا کہ اس کو پکڑ کر ماریں۔ لیکن پیغمبر اسلام نے اس کو روک دیا۔ آپ نے فرمایا: دعوہ فان لصاحب الحق مقالاً (اس کو چھوڑ دو کیوں کہ حقدار کو کہنے کا حق ہوتا ہے) ریاض الصالحین۔ ۳۳۵۔

اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ نزاعی معاملات میں پیغمبر اسلام کے جذبات کیا ہوتے تھے۔ اس طرح کے معاملات میں آپ صرف اپنے اعتبار سے نہیں سوچتے تھے بلکہ آپ فریق ثانی کو پوری رعایت دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔ مذکورہ تاجر نے گفتگو کا جو انداز اختیار کیا وہ بلاشبہ ادب اور تہذیب کے خلاف تھا۔ اس نے آپ کی عزت اور وقار پر حملہ کیا۔ اس نے ایسی بات کہی جو عام طور پر لوگوں کی انا کو بھڑکانے کا سبب بن جاتی ہے۔ مگر آپ نے اپنے منصفانہ مزاج کے تحت ان تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے اپنے جذبات کی رعایت کرنے کے بجائے صرف فریق ثانی کے جذبہ کی رعایت کی۔ آپ نے ہر دوسری بات کو بھلا کر صرف یہ سوچا کہ ایک شخص سے جب میں نے قرض لیا ہے تو اس کو یہ حق ہے کہ وہ مجھ سے اس کا تقاضا کرے۔

حقائق پر اعتماد

۶ھ میں پیغمبر اسلام اور مشرک سرداروں کے درمیان صلح کا وہ معاہدہ ہوا جس کو معاہدۂ حدیبیہ کہا جاتا ہے۔ لمبی بات چیت کے بعد جب معاہدہ کی دفعات طے ہو گئیں تو پیغمبر اسلام نے اس کو کاغذ پر لکھوانا شروع کیا۔ حضرت علی بن ابی طالب اس کی کتابت کر رہے تھے۔ آپ نے کہا کہ ھذا ما صالح علیه محمد رسول الله............ (سیرت ابن کثیر جلد ۳ ص، ۳۲۰) مشرک سردار نے اس پر اعتراض کیا۔ اس نے کہا کہ ہمارے اور آپ کے درمیان یہی تو جھگڑا ہے کہ ہم آپ کو رسول اللہ نہیں مانتے۔ اگر ہم آپ کو اللہ کا

رسول مان لیں تو جھگڑا اپنے آپ ختم ہو جائے گا۔ اس لئے آپ اس طرح لکھئے کہ هذا ما صالح علیه محمد بن عبدالله۔ آپ فوراً اس پر راضی ہو گئے۔

حضرت علی نے آپ سے کہا کہ میں معاہدہ کے کاغذ سے محمد رسول اللہ کا لفظ نہیں مٹا سکتا۔ اس کے بعد پیغمبر اسلام نے کاغذ کو اپنے ہاتھ میں لیا اور رسول اللہ کے لفظ کو مٹا دیا۔ اس کے بعد حضرت علی سے آپ نے کہا کہ اب یہاں محمد بن عبد اللہ لکھ دو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ (ص، ۳۲۱)

پیغمبر اسلام کی اصل حیثیت یہی تھی کہ وہ اللہ کے رسول تھے۔ آپ کا پورا مشن آپ کے اسی دعوے پر کھڑا ہوا تھا۔ رسول اللہ کے لفظ کو مٹانا گویا اپنی اصل شناخت کو مٹا دینے کے ہم معنی تھا۔ یہ ایک بے حد نازک معاملہ تھا۔ رسول اللہ کا لفظ مٹانے کا مطلب لوگوں کو یہ کہنے کا موقع دینا تھا کہ آپ کو خود اپنی شناخت کے بارے میں شک ہے۔ چنانچہ حضرت عمر فاروق غصہ کی حالت میں حضرت ابو بکر کے پاس آئے اور کہا: ألیس برسول الله (ص، ۳۲۰) یعنی کیا وہ خدا کے رسول نہیں ہیں۔

لیکن پیغمبر اسلام نے ان باتوں کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ ایک ایسے بلند انسان تھے جو حقائق میں جینے والا ہو، جو ظواہر سے اوپر اٹھ کر چیزوں کو دیکھ سکے۔ اپنی اسی نفسیات کی بنا پر آپ محسوس کر رہے تھے کہ کاغذ پر خواہ جو بھی لکھا جائے مگر آخر کار جو چیز غالب رہے گی وہ حقیقت ہے۔

آپ کا یہ غیر متزلزل یقین کہ میں خدا کا رسول ہوں، یہی اس بات کے لئے کافی تھا کہ آپ ایک ایسی چیز کو کوئی اہمیت نہ دیں جو خود حقائق کے زور پر ایک دن مٹ کر رہ جائے گی، کوئی نہ اس کا حامی ہو گا اور نہ کوئی اس کا وکیل۔

غیر مصالحانہ انداز

روایت میں آیا ہے کہ پیغمبر اسلام پر قبل از وقت بڑھاپے کے آثار دیکھ کر بعض صحابہ نے پوچھا کہ اے خدا کے رسول کس چیز نے آپ کو بوڑھا کر دیا(یا رسول اللہ ما شیبك) آپ نے اس کے جواب میں فرمایا کہ مجھ کو ہود اور اس کی مثل سورتوں نے بوڑھا کر دیا۔ (شیبتنی ھود واخواتھا)تفسیر ابن کثیر .٤٣٥/٢

سورہ ہود میں وہ کون سی بات ہے جس نے آپ پر اتنا غیر معمولی اثر ڈالا کہ آپ قبل از وقت بوڑھے دکھائی دینے لگے۔اس کا اندازہ سورہ ہود کی آیت نمبر ۱۱۳ سے ہوتا ہے۔

ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار ومالکم من دون اللہ من اولیاء ثم لا تنصرون.اور ان کی طرف نہ جھکو جنھوں نے ظلم کیا،ورنہ تم کو آگ پکڑ لے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی مددگار نہیں۔

اس آیت میں اس وقت کا ذکر ہے جب کہ پیغمبر اسلام نے اپنی دعوت کھول کھول کر بیان کر دی،اس کے باوجود آپ کے مخاطبین کی اکثریت اس کو ماننے پر راضی نہ ہوئی۔خاص طور پر سردار اور پیشوا اس کے انکار پر مصر رہے ایسے وقت میں یہ احساس ابھرتا ہے کہ لوگوں کو اپنے قریب لانے کے لئے دعوت کے نکات میں کسی قدر تبدیلی کر لی جائے،تاکہ وہ مخاطبین کے لئے قابل قبول ہو جائے۔اسی چیز کو مذکورہ آیت میں رکون(جھکاؤ) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

مگر پیغمبر اسلام کو اس قسم کے جھکاؤ سے شدت کے ساتھ روک دیا گیا۔اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ کو دعوت کے سلسلے میں جو چیز سب سے زیادہ مطلوب ہے وہ حق کا بے آمیز اعلان ہے اور جھکاؤ یا مصالحت کی صورت میں حق کا بے آمیز اعلان نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وہ چیز ہے جس نے پیغمبر اسلام کو قبل از وقت بوڑھا بنادیا۔ حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں حق کی مصالحانہ پیغام رسانی انتہائی آسان کام ہے۔ اس کے مقابلہ میں حق کی بے آمیز پیغام رسانی انتہائی مشکل کام۔ مصالحانہ پیغام رسانی میں آدمی کو مقبولیت ملتی ہے، اور بے آمیز پیغام رسانی میں آدمی لوگوں کی نظر میں غیر محبوب بن جاتا ہے۔ مصالحانہ پیغام رسانی میں راستے ہر طرف کھلے ہوئے نظر آتے ہیں، اور بے آمیز پیغام رسانی میں کھلے ہوئے راستے بھی بظاہر بند ہو جاتے ہیں۔ مصالحانہ پیغام رسانی اگر ہموار راستہ پر سفر کرنا ہے تو بے آمیز پیغام رسانی کانٹوں اور پتھروں کے درمیان سفر کرنا ہے۔

پیغمبر اسلام محسوس فرماتے تھے کہ حق کا اعلان صرف وہی ہے جو بے آمیز اعلان ہو، آمیزش والا اعلان سرے سے حق کا اعلان ہی نہیں۔ اس معاملہ کی یہی سنگینی تھی جس نے آپ کو اتنا زیادہ متاثر کیا کہ آپ قبل از وقت بوڑھے دکھائی دینے لگے۔

فتح کے باوجود

مکہ پیغمبر اسلام کا وطن تھا۔ مگر وہاں کے لوگوں نے آپ کو وہاں سے نکلنے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد ظلم اور تشدد اور سرکشی کی تقریباً ۲۰ سالہ تاریخ ہے جس سے آپ کو مجبورانہ طور پر گذرنا پڑا۔ آخر کار حالات بدلے اور رمضان ۸ھ میں مکہ فتح ہو گیا۔ جس شہر سے آپ مظلومانہ نکلے تھے اسی شہر میں آپ دوبارہ فاتحانہ داخل ہوئے۔

مگر اس وقت آپ کے دل کی جو کیفیت تھی وہ اس سے بالکل مختلف تھی جو عام فاتحین کے یہاں نظر آتی ہے۔ دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ مکہ میں داخلہ کے وقت آپ ایک اونٹ پر سوار تھے۔ حالت یہ تھی کہ آپ اس وقت سراپا تواضع بنے ہوئے تھے۔ اللہ کی غیر معمولی نصرت کے احساس نے آپ کو جھکا دیا تھا۔ یہاں تک کہ آپ کی داڑھی اونٹ

کے کجاوے کو چھونے لگی۔ (سیرت ابن ہشام۔ ۲۴/۴)

روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں داخل ہو کر آپ کعبہ کے دروازہ پر کھڑے ہوگئے اور فرمایا: ایک اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، اس نے اپنے وعدہ کو پورا کر دیا، اور اپنے بندے کی مدد فرمائی، اور مخالف گروہوں کو تنہا شکست دے دی۔

لا اله الا الله وحده، لا شريك له، صدق وعده، ونصر عبده، وهزم الاحزاب وحده (ص، ۳۳)

فتح وہ موقع ہے جب کہ لوگ خوشی مناتے ہیں، فخر کرتے ہیں، اپنی کامیابی کا جشن مناتے ہیں۔ اس قسم کی باتیں وہ لوگ کرتے ہیں جن کی نظر اپنے آپ پر ہوتی ہے۔ جو فتح کو خود اپنا ایک کارنامہ سمجھتے ہیں۔ لیکن پیغمبر اسلام کی نفسیات اس سے بالکل مختلف تھی۔ ان کے لئے فتح کا واقعہ ان کا اپنا کارنامہ نہ تھا۔ وہ مکمل طور پر خدا کی طرف سے ظاہر ہونے والا واقعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ایسا واقعہ جو بظاہر ان کا اپنا کارنامہ تھا، اس کو انھوں نے مکمل طور پر خدا کے خانہ میں ڈال دیا۔

ایک دعا

حدیث کی کتابوں میں پیغمبر اسلام کی بہت سی دعائیں نقل کی گئی ہیں۔ یہ دعائیں پیغمبر اسلام کی اندرونی شخصیت کو بتاتی ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کے سینہ میں کس قسم کے احساسات کا طوفان برپا رہتا تھا۔ ان کے اندر کی دنیا کس قسم کے جذبات وخیالات سے ہمیشہ آباد رہتی تھی۔

ان میں سے ایک دعا وہ تھی جو ان الفاظ میں آپ کی زبان سے نکلتی تھی: الهم ارنا الحق حقاً وارزقنا اتباعه وارنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه وارنا الاشياء كماهي

(اے اللہ ہمیں حق کو حق کی صورت میں دکھا اور اس کی پیروی کی توفیق دے اور اے اللہ ہمیں باطل کو باطل کے روپ میں دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق دے۔ اور اے اللہ ہمیں چیزوں کو ویسا ہی دکھا جیسا کہ وہ ہیں)

موجودہ دنیا میں حقیقتوں کے اوپر اشتباہ کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ جو شخص صرف چیزوں کے ظاہر کو جانے وہ ان کو ان کی حقیقت کے اعتبار سے سمجھ نہیں سکتا۔ پیغمبر کو یہ احساس تڑپاتا ہے۔ وہ بیتابانہ اللہ کو پکار کر یہ کہنے لگتا ہے کہ اے اللہ مجھ کو حقیقت بینی کی نعمت عطا فرما، تاکہ میں چیزوں کو ٹھیک ٹھیک سمجھوں، میں ہر چیز کے بارے میں وہی درست رائے قائم کروں جو حقیقت واقعہ کے اعتبار سے ہونا چاہیے۔

صحیح فکر کے بغیر سچی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اسی طرح صحیح فکر کے بغیر صحیح عمل کا ظہور ممکن نہیں، یہی احساس تھا جو شدت اختیار کر کے مذکورہ قسم کی دعا میں ڈھل گیا تھا۔ یہ دعا ایک مومنانہ قلب کی تصویر ہے جو پیغمبر کے سینے میں اعلیٰ ترین درجہ میں موجود ہوتا ہے۔

حکمتِ نبوی

پیغمبر اسلام ﷺ کی صفات میں سے ایک صفت یہ ہے کہ آپ صاحب حکمت تھے اور لوگوں کو حکیمانہ روش اختیار کرنے کی تلقین فرماتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ کے بہت سے اقوال حدیث کی کتابوں میں آئے ہیں۔ مثال کے طور پر آپ نے فرمایا: لاحسد الا فی اثنتین رجل آتاه الله مالا فسلطه علی هلكته فی الحق ،واخر اتاه الله حكمة فهو يقضی بها ويعلمها (فتح الباری ،بشرح صحيح البخاری ۱۲۸/۱۳)

یعنی حسد نہیں سوا دو قسم کے آدمیوں پر۔ ایک وہ آدمی جس کو اللہ نے مال دیا تو وہ اس کو حق کے راستہ میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرتا ہے۔ اور دوسرا آدمی وہ جس کو اللہ نے حکمت دی تو وہ اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کی تعلیم دیتا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور کہا کہ اے اللہ اس کو حکمت عطا فرما (ضمنی النبی ﷺ الی صدره وقال اللهم علمه الحكمة)فتح الباری ۱۲٦/۷

اسی طرح اور بہت سی روایتیں ہیں جن سے حکمت کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مثلاً رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: نعم المجلس مجلس ينشر فيه الحكمة (الدارمی مقدمه) یعنی کیا ہی اچھی ہے وہ مجلس جس میں حکمت کی بات کی جائے۔ اسی طرح آپ نے فرمایا کہ لیس هدية افضل من كلمة حكمة (الدارمی ، مقدمه) یعنی حکمت کی بات سے زیادہ افضل کوئی تحفہ نہیں۔

حکمت کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ اس کی بابت یہ تعلیم دی گئی کہ دوسری قوموں میں

اگر کوئی حکمت کی چیز ملے تو اس کو لینے سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا: الکلمة الحکمة ضالة المومن حیث وجدها فهواحق بها (الترمذی، کتاب العلم) یعنی حکمت کی بات مومن کا گم شدہ سرمایہ ہے وہ جہاں اس کو پائے تو وہی اس کا زیادہ حق دار ہے۔

بعض روایت کے مطابق، حکمت اور تفقہ کی اہمیت عبادت سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ الترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فقیه واحداشد علی الشیطان من الف عابد (مشکاة المصابیح ۷۵/۱) یعنی ایک فقیہ، شیطان کے اوپر ہزار عابدوں سے بھی زیادہ بھاری ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی حکمت کی مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ نبوت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لئے آپ نے ہر موقع پر اور ہر مرحلہ میں حکمت کا طریقہ اختیار فرمایا۔ یہاں اس سلسلہ میں آپ کی زندگی سے چند مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔

نزاع کے موقع پر

پیغمبر اسلام ﷺ کی عمر جب ۳۵ سال تھی اس وقت مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا۔ کعبہ کی عمارت بعض اسباب سے منہدم ہوگئی۔ اس کے بعد قریش کے لوگوں نے اس کی نئی تعمیر کی۔ اس دوران یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ حجر اسود کو کون اٹھائے اور اس کو دوبارہ اس کی جگہ پر کعبہ کی دیوار میں نصب کرے۔ یہ چونکہ فضیلت کا ایک معاملہ تھا، ہر ایک یہ چاہنے لگا کہ وہی اس کو اٹھا کر نصب کرے اور اس شرف کا مالک بنے۔

اس سوال پر قریش کے لوگوں میں کئی دن تک جھگڑا جاری رہا اور کوئی اتفاقی فارمولا طے نہ ہوسکا آخر کار قریش کے ایک بزرگ کی تجویز کے مطابق وہ اس پر راضی ہوئے کہ

کل صبح کو جو آدمی سب سے پہلے کعبہ میں داخل ہو، وہی اس مسئلہ کا فیصلہ کرے اور تمام لوگ اس کے فیصلہ کو مان لیں۔ اگلی صبح کو جب لوگ دوبارہ کعبہ میں آئے تو انھوں نے دیکھا کہ کعبہ میں داخل ہونے والے سب سے پہلے شخص رسول اللہ ﷺ ہیں۔ ہر ایک نے بیک زبان کہا: هذا الامين ،رضينا هذا محمد(سیرت ابن ہشام ۱/ ۲۱۴) یعنی یہ تو محمد الامین ہیں، ہم ان کے فیصلہ پر راضی ہیں۔

رسول اللہ نے لوگوں سے کہا کہ ایک چادر لے آؤ۔ وہ لوگ چادر لائے تو آپ نے اس کو زمین پر پھیلایا اور حجر اسود کو اٹھا کر اس کے اوپر رکھ دیا۔ پھر آپ نے لوگوں سے کہا کہ تم سب لوگ چادر کے کناروں کو پکڑو اور اس کو اٹھا کر کعبہ کی دیوار کے پاس لے چلو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ پھر آپ نے حجر اسود کو چادر سے اٹھایا اور اس کو کعبہ کی دیوار میں نصب کر دیا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا یہ عمل ایک بہترین نمونہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی نزاعی معاملہ کو کس طرح خوش اسلوبی کے ساتھ طے کیا جاسکتا ہے۔ وہ یہ کہ حکیمانہ انداز اختیار کرتے ہوئے ہر ایک کو اس میں شریک کر لیا جائے۔ اس طرح کا معاملہ لوگوں کے لئے اکثر وقار کا سوال بن جاتا ہے۔ اگر حسن تدبیر سے لوگوں کو یہ احساس دلایا جائے کہ ان کا وقار محفوظ ہے تو مسئلہ کو حل کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔

آغاز کار

پیغمبر اسلام ﷺ کو جب مکہ میں نبوت ملی تو آپ نے اپنے عمل کا یہ طریقہ اختیار فرمایا کہ آپ لوگوں کے پاس جاتے اور ان سے کہتے کہ اے لوگو، کہو کہ ایک اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں، تم فلاح پاؤ گے (ایھا الناس قولوا لاالہ الا اللہ تفلحوا) یعنی تم لوگ شرک کو

چھوڑدو اور ایک خدا کی پرستش کا طریقہ اختیار کرو، تم فلاح پاؤ گے۔

اس وقت کعبہ میں ۳۶۰ بت رکھے ہوئے تھے۔ اب ایک صورت یہ تھی کہ کعبہ کو بتوں سے پاک کرکے اس کو توحید کے مرکز کے طور پر بنایا جاتا۔ مگر اس وقت وہ عملاً شرک وبت پرستی کا مرکز بن گیا تھا۔ ان حالات میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے دو مختلف راستے تھے۔ ایک یہ کہ کعبہ سے بتوں کو نکال کر وہاں دوبارہ توحید کا ماحول قائم کریں اور اس کو مرکز بنا کر اپنی موحدانہ تحریک چلائیں۔

ایک صورت قولی دعوت سے آغاز کرنے کی تھی۔ اور دوسری صورت عملی اقدام سے آغاز کرنے کی۔ جیسا کہ تاریخ سے ثابت ہے، آپ نے عملی اقدام سے مکمل طور پر پرہیز کیا، اور صرف قولی دعوت کے نہج پر مکہ میں اپنا پیغمبرانہ مشن جاری فرمایا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی دعوت یا اسلامی تحریک کا صحیح پیغمبرانہ طریقہ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ پہلے پرامن فکری مہم کے ذریعہ لوگوں کی سوچ اور کردار میں تبدیلی لائی جائے۔ یہ ابتدائی کام جب قابل لحاظ حد تک انجام پا جائے، اس کے بعد حسب حالات عملی اقدام کا آغاز کیا جائے۔

توہین کو برداشت کرنا

مشہور سیرت نگار ابن اسحٰق بتاتے ہیں کہ قریش نے رسول اللہ ﷺ کا نام مذمم رکھا تھا۔ پھر وہ آپ کا سب وشتم کرتے تھے۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں سے فرماتے تھے کہ کیا تم کو اس پر تعجب نہیں کہ اللہ نے کس طرح مجھ کو قریش کی ایذارسانی سے بچالیا۔ وہ سب وشتم کرتے ہیں اور ایک مذمم شخص کی ہجو کرتے ہیں اور میں محمد ہوں۔

وكانت قريش انما تسمى رسول اللهﷺ مذمما ثم يسبونه فكان رسول اللهﷺ يقول: "الا تعجبون لما صرف الله عنى من اذى قريش يسبون ويهجون مذمما وانا محمد" (سيرت ابن هشام ۱/ ۳۷۹)

پیغمبر اسلامﷺ کا اصل نام محمد تھا جس کا مطلب ہے تعریف کیا ہوا۔ مکی دور میں جب قریش کو آپ کے ساتھ عناد پیدا ہوا تو انھیں پسند نہیں آیا کہ وہ آپؐ کو محمد (تعریف کیا ہوا) جیسے نام سے پکاریں۔ انھوں نے اپنے جذبہ عناد کی تسکین کے لئے بطور خود آپ کا نام مذمم رکھ دیا جس کے معنی ہیں مذمت کیا ہوا۔ قریش جب آپ کو برا بھلا کہتے تو وہ آپ کے لئے محمد کا لفظ استعمال نہ کرتے بلکہ وہ مذمم کا لفظ بول کر آپ کو برا بتاتے۔ حتی کہ ابولہب کی بیوی ام جمیل نے خود آپ کے سامنے آکر کہا: مذمما عصينا (صفحہ ۳۷۹) یعنی یہ مذمم ہیں اور ہم ان کو نہیں مانتے۔

یہ بلاشبہ ایک اشتعال انگیزی تھی اور آپ کی توہین بھی۔ لیکن پیغمبر اسلام نے ایک خوبصورت جواب دے کر اس کو نظر انداز کر دیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لوگ مذمم کی سب و شتم کرتے ہیں۔ مگر ان کی سب و شتم میرے اوپر پڑنے والی نہیں کیوں کہ میرا نام محمد ہے نہ کہ مذمم۔

پیغمبر اسلامﷺ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو یہاں عبداللہ بن ابی آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ اس نے اگرچہ اسلام قبول کر لیا تھا مگر حسد کے جذبہ کے تحت وہ آپ کا شدید مخالف بن گیا۔ آپ کی توہین کرنا، آپ کا سب و شتم کرنا اور آپ کے خلاف بری باتیں پھیلانا اس کا سب سے بڑا مشغلہ بن گیا۔ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ وہ سب سے بڑا شاتم رسول تھا۔ حضرت عمر فاروق نے رسول اللہﷺ سے کہا کہ مجھے اجازت دیجئے کہ میں اس کو قتل

کردوں۔ آپ نے فرمایا:دعه لا یتحدث الناس ان محمدا یقتل اصحابه.(فتح الباری ۸/ ۵۲۰) یعنی اس کو چھوڑدو۔ لوگ یہ نہ کہیں کہ محمد اپنے ساتھیوں کو قتل کرتے ہیں۔

اس واقعہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کا ایک خاص اسوہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ...... توہین کو برداشت کرلو۔ کیونکہ اگر تم نے توہین کو برداشت نہ کیا تو اس سے بھی زیادہ بڑی برائی سامنے آئے گی، اور وہ خدا کے دین کی بدنامی ہے۔

قبل از وقت اقدام نہیں

پیغمبر اسلام ﷺ تقریباً ۱۳ سال تک مکہ میں رہے یہاں کی اکثریت آپ کی مخالف بنی رہی۔ انھوں نے ہر طرح آپ کو ستایا۔ تاہم آپ کے دعوتی جدوجہد کے نتیجہ میں وہاں کے تقریباً دوسو مرد اور عورت اسلام میں داخل ہوگئے۔ یہ لوگ بار بار آپ سے یہ کہتے کہ ہم ظلم کے خلاف جہاد کریں گے۔ مگر آپ ہمیشہ انھیں صبر کی تلقین کرتے رہے۔ مثلاً حضرت عمر فاروق نے قریش کے مظالم کے خلاف جہاد کی اجازت مانگی تو آپ نے فرمایا: یا عمر انا قلیل(سیرت ابن کثیر ۱/ ٤٤١) یعنی اے عمر ہم تھوڑے ہیں۔

مکی دور کے آخر میں مدینہ کے تقریباً دوسو آدمی اسلام میں داخل ہوگئے۔ ان لوگوں کو جب معلوم ہوا کہ مکہ کے لوگ آپ کو اور آپ کے اصحاب کو ظلم وزیادتی کا نشانہ بنارہے ہیں تو انھوں نے بھی کہا کہ ہم کو ان ظالموں کے خلاف لڑنے کی اجازت دیجئے مگر ان سے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ صبر کرو کیوں کہ مجھے قتال کی اجازت نہیں دی گئی۔ (اصبروا فانی لم اومر بالقتال)

پیغمبر اسلام ﷺ نے ہر قسم کے ظلم وزیادتی کے باوجود تقریباً ۱۵ سال تک یکطرفہ

طور پر صبر وبرداشت کا طریقہ اختیار کیا۔اس کے بعد پہلی بار آپ غزوۂ بدر کے موقعہ پر اپنے اصحاب کو لیکر دشمنوں سے مقابلے کے لئے نکلے۔یہ بھی آپ نے اس وقت کیا جب کہ اللہ تعالی کی طرف سے یہ کھلا وعدہ آگیا کہ آسمان سے فرشتے تمہاری مدد کے لئے آئیں گے۔(الانفال۹)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ یہ نہیں کہ جب بھی کوئی ظلم کرے تو فوراً اس کے خلاف کارروائی شروع کردی جائے۔آپ کی سنت یہ ہے کہ ظلم کے باوجود صبر واعراض کا طریقہ اختیار کیا جائے۔عملی اقدام صرف اس وقت کیا جائے جب کہ اس کا نتیجہ خیز ہونا یقینی بن گیا ہو۔

مقام نزاع سے ہٹ جانا

پیغمبر اسلام ﷺ نبوت کے بعد تقریباً ۱۳سال تک مکہ میں رہے۔کچھ لوگوں نے آپ کا ساتھ دیا مگر مکہ کی اکثریت آپ کی شدید مخالف بنی رہی۔جب انھوں نے دیکھا کہ صرف مخالفت آپ کے مشن کو ختم کرنے کے لئے کافی نہیں تو وہ پیغمبر اسلام ﷺ کے قتل کے درپے ہوگئے۔انھوں نے طے کیا کہ مکہ کے تمام سردار بیک وقت حملہ کر کے آپ کو قتل کردیں تاکہ آپ کی تحریک توحید کا خاتمہ ہو جائے۔

یہ ایک نازک موقع تھا۔بظاہر ایک صورت یہ تھی کہ آپ اپنے ساتھیوں کو لیکر ان سے مقابلہ کریں۔مگر آپ نے اس معاملہ کو نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا چونکہ اس وقت کے حالات میں مسلح مقابلہ غیر مفید ہوتا اس لئے آپ نے اعراض کے اصول پر عمل فرمایا اور مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت نزاع سے ٹکرانا نہیں ہے بلکہ نزاع کے مقام سے ہٹ جانا

ہے۔اس طرح آدمی کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ اپنی قوتوں کو بچا کر انھیں زیادہ مفید طور پر استعمال کر سکے۔

اغیار کی رعایت

اسلام میں ایک مستقل اصول وہ ہے جس کو قرآن میں تالیف قلب کہا گیا ہے۔(التوبہ ۶۰) تالیف قلب کا مطلب ہے دلوں کو جوڑنا، لوگوں کو اپنے سے مانوس کرنا۔یہ مقصد صرف اس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے کہ دوسروں کی رعایت کی جائے۔دوسروں کے جذبات اور مفادات کا احترام کیا جائے۔تالیف کا یہ اصول اسلامی دعوت کا ایک اہم اصول ہے۔وہ ابدی طور پر ہر انسانی سماج میں مطلوب ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں تالیف قلب کے اس اصول پر عمل فرمایا۔ مثلاً جب آپ ہجرت کر کے مدینہ آئے تو اس وقت وہاں اہل ایمان کے ساتھ مشرکین اور یہود بھی آباد تھے۔اس وقت آپ نے اپنی طرف سے ایک منشور جاری فرمایا جس کو عام طور پر صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔اس میں آپ نے اعلان فرمایا کہ ہر گروہ کو اپنے مذہب اور کلچر کی آزادی ہو گی۔ہر قبیلہ کے نزاعی معاملات اس کی اپنی قبائلی روایات کے تحت طے کئے جائیں گے۔عقیدہ اور کلچر کے معاملہ میں کسی کو مجبور نہیں کیا جائے گا۔

یہود کے ساتھ آپ نے خصوصی رعایت کا معاملہ فرمایا، رمضان کے روزہ کی فرضیت سے پہلے آپ بھی انھیں دنوں میں روزہ رکھتے رہے جب کہ یہود روزہ رکھتے تھے۔تحویل قبلہ کا حکم آنے سے پہلے تقریباً سترہ مہینہ تک آپ نے یہود کے قبلہ (بیت المقدس) کو اپنا قبلہ بنائے رکھا۔۔یہود کے قبلۂ عبادت کو اپنا قبلہ بنانا اس لئے تھا کہ آپ امید رکھتے تھے کہ اس طرح وہاں کے یہود آپ سے مانوس ہوں گے اور آپ کے قریب

آجائیں گے۔ (تفسیر القرطبی ۲؍۱۵۰)

پیغمبر اسلام ﷺ کا طریقہ مخالفت کے جواب میں مخالفت نہ تھا۔ بلکہ مخالفت کے جواب میں رعایت تھا۔ آپ کی سوچ یہ نہیں تھی کہ لوگوں کو دبا کر انھیں اپنا تابع بنائیں۔ اس کے برعکس آپ کا طریقہ یہ تھا کہ لوگوں کے ساتھ شفقت اور رعایت کا معاملہ کیا جائے، ان کے دل کو نرم کر کے انھیں اپنا ساتھی بنایا جائے۔

رازداری

فتح مکہ کے واقعات کے ذیل میں آیا ہے کہ مدینہ میں آپ نے سفر کے لئے تیاری کا حکم دیا۔ عام مسلمان ضروری تیاری میں مصروف ہو گئے۔ اس زمانے میں حضرت ابو بکر صدیق اپنی صاجزادی عائشہؓ کے گھر میں آئے جو پیغمبر اسلام ﷺ کی اہلیہ تھیں۔ وہ اس وقت ضروری تیاری کر رہی تھیں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے اپنی صاجزادی سے پوچھا کہ کیا رسول اللہ ﷺ نے تم کو اس کا حکم دیا ہے۔ حضرت عائشہ نے کہا کہ ہاں۔ حضرت ابو بکر صدیق نے دوبارہ پوچھا کہ یہ تیاری کہاں کے سفر کے لئے ہے۔ حضرت عائشہ نے جواب دیا کہ خدا کی قسم مجھ کو نہیں معلوم (واللہ ما ادری) سیرت ابن ہشام ۴؍۱۴)

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت یہ تھی کہ آپ نازک معاملات میں ہمیشہ رازداری کا طریقہ اختیار فرماتے تھے۔۔ یہی آپ نے فتح مکہ کی مہم میں کیا۔ مدینہ سے آپ اپنے دس ہزار اصحاب کے ساتھ نکلے مگر آپ نے لوگوں کو یہ نہیں بتایا کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم چلتے ہوئے اس مقام پر پہنچے جہاں سے راستہ سیدھا مکہ کی طرف جاتا تھا، اس وقت ہم نے جانا کہ یہ سفر مکہ کے لئے ہے۔

نازک اجتماعی معاملات میں رازداری بے حد اہم ہے۔ اکثر اوقات کامیابی کا انحصار

اس پر ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو آپ کے منصوبہ کا پیشگی علم نہ ہو سکے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس حکمت کو نہایت اہتمام کے ساتھ اپنی زندگی میں اختیار فرمایا۔

صورت موجودہ کو مان لینا

جب بھی دو آدمیوں یا دو گروہوں میں نزاع پیدا ہو تو بالآخر دونوں کے درمیان ایک عملی حالت قائم ہو جاتی ہے۔ جس کو اسٹیٹس کو (Status quo) کہا جاتا ہے۔ اس اسٹیٹسکو کو بدلنے کی کوشش اکثر حالات میں بے نتیجہ ہوتی ہے۔ کیونکہ فریق ثانی اپنی پوری طاقت کے ساتھ جوابی کارروائی کرتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ صورت موجودہ (اسٹیٹس کو) بدستور باقی رہتی ہے۔ مزید نقصان یہ ہوتا ہے کہ اس بے نتیجہ کوشش میں طرفین کے حاصل شدہ مواقع بھی بے فائدہ طور پر ضائع ہو جاتے ہیں۔

اس طرح کے نزاعی معاملہ میں پیغمبر اسلام کی سنت یہ ہے کہ موجودہ حالت (اسٹیٹس کو) کو مان لو۔ اس اسٹیٹس کو ازم کا یہ عظیم فائدہ ہوتا ہے کہ آپ کو یہ فرصت مل جاتی ہے کہ اپنی قوتوں کو مزید استحکام میں لگا دیں۔ مقام نزاع سے ہٹ کر اپنے آپ کو اتنا مضبوط بنائیں کہ آخر کار طاقت کا توازن بدل جائے اور کسی بڑے ٹکراؤ کے بغیر معاملہ کا فیصلہ کیا جا سکے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیبیہ کے موقع پر یہی حکمت اختیار فرمائی۔ آپ مدینہ سے روانہ ہو کر حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو مکہ کے لوگ بھی چل کر وہاں آگئے۔ انھوں نے کہا کہ ہم آپ کو آگے جانے نہیں دیں گے۔ اس طرح حدیبیہ کے مقام پر ایک تعطل کی حالت پیدا ہو گئی۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا نہیں کیا کہ اس تعطل کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کریں بلکہ آپ حدیبیہ ہی سے دوبارہ مدینہ واپس آگئے۔

یہ گویا اپنے اور فریق ثانی کے درمیان قائم شدہ اسٹیٹسکو کو مان لینا تھا۔ اس حکمت کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیغمبر اسلام کو یہ موقع مل گیا کہ وہ اپنے آپ کو مزید مستحکم کر سکیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اور صرف دو سال کے اندر آپ کے لئے مکہ میں فاتحانہ داخلہ ممکن ہو گیا۔

مشکل میں آسانی

پیغمبر اسلام ﷺ نے ۸ھ میں مکہ فتح کیا۔ اس کے بعد آپ اپنے اصحاب کے ساتھ مکہ سے طائف کے لئے روانہ ہوئے۔ اس زمانہ میں عرب میں ہموار سڑکیں نہیں تھیں۔ چلتے ہوئے ایک جگہ ایک تنگ راستہ آیا جو دو پہاڑیوں کے درمیان سے گذرتا تھا۔ چنانچہ یہ راستہ اپنی اسی صفت کے ساتھ مشہور ہو گیا تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب اس جگہ پہنچے تو آپ نے لوگوں سے پوچھا کہ اس راستہ کا نام کیا ہے (ما اسم هذه الطريق) لوگوں نے جواب دیا کہ اس کا نام تنگ راستہ ہے (فقيل له الضيقة) آپ نے جواب دیا کہ نہیں، یہ ایک آسان راستہ ہے (فقال بل هي اليسرى) سیرت ابن ہشام ۴/۱۲۷)

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ کے ساتھ دس ہزار سے زیادہ آدمی تھے۔ یہ لوگ اگر افقی انداز میں پھیل کر چلتے تو یقیناً ان کے لئے اس راستہ سے گذرنا مشکل ہوتا، ایسی حالت میں وہ ان کے لئے تنگ بن جاتا۔ لیکن یہی لوگ اگر قطار بنا کر چلیں تو ان کے لئے راستہ سے گذرنا مشکل نہ رہے گا، اور وہ بظاہر تنگی کے باوجود ان کے لئے عملی طور پر آسان ہو جائے گا۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنے جواب میں اسی عملی حکمت کی طرف اشارہ فرمایا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس واقعہ سے زندگی کا ایک اہم راز معلوم ہوتا ہے۔ اور وہ حسب حالت تدبیر ہے۔ اس حکیمانہ تدبیر کا تعلق زندگی کے تمام معاملات سے ہے۔ اس

تدبیر کو استعمال کر کے زندگی کی ہر مشکل کو آسان بنایا جاسکتا ہے۔

تدبیری پسپائی

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ۸ھ میں ایک جنگ ہوئی۔ یہ شام کی سرحد پر موتہ کے مقام پر ہوئی اسی نسبت سے اس کو جنگ موتہ کہا جاتا ہے۔ اس جنگ کے موقع پر مسلمانوں کی تعداد صرف تین ہزار تھی۔ اس کے مقابلہ میں فریق ثانی کی فوجی تعداد غیر متناسب طور پر بہت زیادہ تھی۔ آخری مرحلہ میں خالد بن الولید اس کے سردار مقرر ہوئے انھوں نے لڑائی کو غیر مفید سمجھ کر واپسی کا فیصلہ کیا۔ وہ تدبیری پسپائی (Tactical retreat) کے اصول پر موتہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گئے۔

عربوں کا مزاج لڑنے مرنے کا مزاج تھا۔ وہ اس پسپائی کی حکمت کو سمجھ نہ سکے۔ چنانچہ جب وہ مدینہ پہنچے تو وہاں کے نوجوانوں نے یا فرار کہہ کر ان کا استقبال کیا۔ یعنی اے بھاگنے والو۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس کو سنا تو آپ نے اس کی تردید فرمائی۔ آپ نے کہا کہ یہ لوگ بھاگنے والے نہیں ہیں بلکہ خدا نے چاہا تو وہ اقدام کرنے والے ہیں۔ (لیسوا بالفرار ولکنهم الکرار انشاء الله تعالی) (سیرت ابن ہشام ۳/۴۳۸)

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس ارشاد سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے نزدیک صحیح اقدام وہ ہے جو نتیجہ خیز ثابت ہو سکے۔ محض جوش اور وقار کے لئے لڑ کر مر جانا کوئی مطلوب اسلامی کام نہیں۔ اگر اہل ایمان کے مقابلے میں فریق ثانی کی طاقت فیصلہ کن حد تک زیادہ ہو تو ایسی حالت میں مقابلہ کے لئے اقدام نہیں کیا جائے گا۔ حتی کہ اگر مقابلہ پیش آجائے تو تدبیری پسپائی اختیار کی جائے گی۔ تاکہ مزید تیاری کر کے اپنے آپ کو نتیجہ خیز اقدام کے قابل بنایا جاسکے۔

اصلاح میں تدریج

ایک روایت کے مطابق، حضرت عائشہ نے فرمایا کے قرآن میں سب سے پہلے وہ آیتیں اور سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت کا اور جہنم کا ذکر تھا۔ یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوگئے تو اس کے بعد حلال و حرام کے احکام اترے۔ اور اگر ایسا ہوتا کہ شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ تم لوگ شراب نہ پیو تو یقیناً لوگ کہتے کہ ہم شراب کبھی نہیں چھوڑیں گے۔ اسی طرح اگر شروع ہی میں یہ حکم اترتا کہ زنا نہ کرو تو لوگ کہتے کہ ہم کبھی زنا نہیں چھوڑیں گے۔ (صحیح البخاری، کتاب فضائل القرآن، باب تالیف القرآن، بحوالہ فتح الباری، ۸/۶۵۵)

اس روایت سے ایک عظیم حکمت نبوی معلوم ہوتی ہے۔ یہ وہی عملی حکمت ہے جس کو تدریج (Graduation) کہا جاتا ہے۔ انسان کی اصلاح ایک مشکل اور پیچیدہ کام ہے۔ انسان عام طور پر کچھ خیالات اور عادات سے مانوس ہو جاتے ہیں۔ وہ اسی کو درست سمجھنے لگتے ہیں۔ اس بنا پر وہ کسی نئی چیز کو فوری طور پر قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔ ایسی حالت میں انسانوں کی اصلاح کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کام کو حکمت اور تدریج کے ساتھ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے عرب میں پہلے لوگوں کی سوچ کو بدلا۔ لوگوں کے اندر قبولیت کا مزاج پیدا کیا۔ یہاں تک کہ جب ان کے اندر اصلاح کو قبول کرنے کی استعداد پیدا ہو گئی تو اس کے بعد آپ نے شرعی احکام کا نفاذ فرمایا۔ اگر آپ فکری تطہیر اور مزاج سازی کے بغیر شریعت کے قوانین نافذ کرتے تو یہ انسانی فطرت کے خلاف ہوتا، اور وہ انقلابی نتیجہ برآمد نہ ہوتا جو عرب کے سماج میں برآمد ہوا۔

عملی حالات کی رعایت

پیغمبر اسلام ﷺ نے ذی الحجہ ۹ھ میں حج کا فریضہ ادا فرمایا۔ اس کو عام طور پر حجۃ الوداع کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر ایک لاکھ سے زیادہ مسلمان اکٹھا تھے۔ آپ نے اپنے خطبہ میں جو باتیں فرمائیں ان میں سے ایک وہ تھی جس کو انسانی مساوات کا اعلان کہا جاسکتا ہے۔ آپ نے اس موقع پر یہ تاریخی الفاظ فرمائے کہ کسی عربی کو کسی عجمی پر فضیلت نہیں، کسی سفید فام کو کسی سیاہ فام پر فضیلت نہیں۔ فضیلت کا تعلق صرف دین اور تقوی سے ہے۔

اس خطبہ کے تقریباً ڈھائی ماہ بعد مدینہ میں آپ کی وفات ہو گئی۔ آپ کی وفات کے بعد یہ مسئلہ پیدا ہوا کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ مذکورہ اعلان کے مطابق بظاہر صرف یہ ہونا چاہئے تھا کہ دین اور تقوی کی بنیاد پر خلافت کا فیصلہ کیا جائے نہ کہ نسل اور قبیلہ کی بنیاد پر۔ مگر عملاً ایسا نہیں ہوا۔

آپ کی وفات کے بعد مدینہ کی ایک چوپال (ثقیفہ بنی ساعدہ) میں مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ لوگوں کا پہلا رجحان یہ تھا کہ سعد بن عبادہ کو خلیفہ بنایا جائے جو مدینہ کے ایک قبیلہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اس وقت حضرت ابو بکر صدیق نے رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث پیش کی کہ الائمۃ من قریش۔ یعنی خلیفہ یا امام قریش سے ہو گا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ سعد بن عبادہ چونکہ قبیلہ قریش سے نہیں ہیں اس لئے ان کو خلیفہ نہیں بنایا جاسکتا۔ کسی قدر بحث کے بعد آخر کار لوگوں کا اس پر اتفاق ہو گیا کہ قبیلہ قریش ہی کے کسی شخص کو خلیفہ بنایا جائے۔ اس کے مطابق حضرت ابو بکر صدیق خلیفہ اول مقرر ہوئے جو کہ قریش سے تعلق رکھتے تھے۔

بظاہر یہ ایک متضاد بات ہے۔ پھر پیغمبر اسلام ﷺ نے ایسا کیوں فرمایا۔ اس کے

پیچھے ایک عظیم حکمت تھی۔ وہ یہ کہ خلیفہ یا حکمراں کو ایک وسیع انسانی سماج پر احکام کا نفاذ کرنا ہوتا ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ لوگ خلیفہ کی اطاعت پر راضی ہو جائیں۔ یہ اطاعت رضاکارانہ ہونا چاہئے۔ جبری اطاعت کے ذریعہ وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جو اسلامی خلافت کا مقصود ہے۔

قدیم عرب میں سیکڑوں سال کی تاریخ کے نتیجہ میں قریش کے لوگوں کو سرداری کا درجہ حاصل ہو گیا تھا۔ عوامی نفسیات کسی ایسے شخص کی سیادت کو آسانی کے ساتھ قبول کر لیتی تھی جس کا تعلق قریش کے قبیلہ سے ہو۔ اسی سماجی صورت حال کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ الائمۃ من قریش۔ یہ کوئی ابدی حکم نہیں تھا۔ اس کا مطلب صرف یہ تھا کہ کسی قوم میں جس گروہ کو قریش جیسی سیاسی حیثیت حاصل ہو جائے، وہاں اسی گروہ کے کسی فرد کو قوم کے اوپر حاکم بنایا جائے۔

اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عملیت (Pragmatism) بھی رسول اللہ ﷺ کی سنتوں میں سے ایک سنت ہے۔ انفرادی معاملہ میں ایک شخص کو ہمیشہ نظری معیار سامنے رکھنا چاہئے۔ مگر اجتماعی معاملات میں بعض اوقات نظری معیار قابل عمل نہیں ہوتا، اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ ایسے معاملہ میں نظری معیار کو چھوڑ کر عملی تقاضے کے مطابق فیصلہ کیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو زندگی کا نظام ہموار طور پر نہیں چل سکتا۔

مستقبل بینی

فتح مکہ کے بعد عرب میں وہ دور آیا جس کو تاریخ میں عام الوفود کہا جاتا ہے۔ عرب کے قبائل مدینہ آکر اسلام قبول کرنے لگے۔ ان میں سے ایک قبیلہ ثقیف بھی تھا جو طائف سے آیا تھا۔ یہ لوگ مدینہ آئے تو انھوں نے ایک انوکھی شرط پیش کر دی۔ انھوں نے کہا کہ

ہم اسلام تو قبول کرلیں گے لیکن ہم نہ زکوٰۃ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔

یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ عام لوگ اس قسم کے اسلام کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ لیکن پیغمبر اسلام ﷺ نے حال سے اوپر اٹھ کر مستقبل کو دیکھا۔ آپ نے اپنی بصیرت کے تحت یہ سمجھا کہ یہ لوگ جب اسلام میں داخل ہو کر مسلم معاشرہ کا جزء بن جائیں گے تو وہ اپنے آپ سب کچھ کرنے لگیں گے۔ چنانچہ آپ نے ان کی شرطوں کو مانتے ہوئے انھیں اسلام میں داخل کرلیا۔ لوگوں کے اشکال کو رفع کرنے کے لئے آپ نے فرمایا کہ جب وہ اسلام قبول کرلیں گے تو اس کے بعد وہ زکوٰۃ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے۔ (سیتصدقون ویجاھدون اذااسلموا) سیرت ابن کثیر ۵۶/۴۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اس اسوہ سے ایک عظیم حکمت معلوم ہوتی ہے۔ یہ حکمت ایک لفظ میں مستقبل بینی ہے۔ انسان کوئی پتھر نہیں ہے جو تاثر کو قبول نہ کرے۔ انسان ایک ایسی مخلوق ہے جو ہمیشہ بدلتا رہتا ہے۔ انسان کے حال پر اس کے مستقبل کو قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ آدمی سے معاملہ کرتے ہوئے ہمیشہ اس حقیقت کو سامنے رکھنا چاہئے۔ بوقت معاملہ فوری تبدیلی پر اصرار سے ضد پیدا ہوتی ہے۔ اس کے برعکس اگر وسعت ظرف کا طریقہ اختیار کیا جائے تو اپنے آپ ایسا ہوگا کہ آدمی مستقبل میں عین وہی بن جائے گا جیسا کہ حال میں ہم اس کو دیکھنا چاہتے تھے۔

پیغمبرانہ پالیسی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ پیغمبر کا طریقہ عزیمت کا طریقہ ہے نہ کہ رخصت کا طریقہ۔ مگر یہ ایک بے بنیاد بات ہے۔ کسی عملی روش کو اختیار کرنے کے سلسلہ میں اصل اعتبار حالات وظروف کا کیا جاتا ہے نہ کہ کسی مطلق آئیڈیل کا۔ اسلام میں عزیمت کی اہمیت بھی اتنی ہی ہے جتنی رخصت کی۔ ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ کے لئے افضل ہے اور نہ غیر افضل۔ اس معاملے میں ٹھیک یہی بات سیرت کے مطالعہ سے ثابت ہوتی ہے۔

قرآن میں عزیمت کا لفظ اس معنی میں نہیں آیا ہے جس معنی میں وہ عام طور پر مشہور ہے۔ قرآن میں عزیمت کا لفظ عدم اقدام پر جمنے کے لئے استعمال ہوا ہے نہ کہ پرجوش طور پر اقدام کرنے کے لئے، جیسا کہ حسب ذیل آیت سے معلوم ہوتا ہے:

فاصبر کماصبر اولو ا العزم من الرسل و لا تستعجل لهم (الاحقاف ۳۵)

پس تم صبر کرو جس طرح عزیمت والے پیغمبروں نے صبر کیا۔ اور ان کے لئے جلدی نہ کرو۔

اس آیت میں واضح طور پر صبر کے طریقے کو عزیمت کا طریقہ کہا گیا ہے۔ یعنی فریق ثانی کی اشتعال انگیزی، اس کی ضرر رسانی اور اس کی طرف سے مخالفانہ کارروائیوں کے باوجود یک طرفہ طور پر صبر کرنا اور اپنے آپ کو جوابی اقدام سے روکے رکھنا، اسی کا نام صبر ہے اور اسی صبر کو قرآن میں عزم وہمت کا طریقہ بتایا گیا ہے۔

رخصت کیا ہے۔ رخصت کم ہمتی یا عمل سے فرار کا نام نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک تدبیر ہے۔ وہ عمل کے لئے زیادہ بہتر موقع حاصل کرنے کا نام ہے نہ کہ عمل کو ترک کرنے کا۔

مکی دور کے آخر میں جب دشمنوں نے تلواروں سے مسلح ہو کر رسول اللہ کے مکان کو گھیر لیا اور آپ کے قتل کے درپے ہوگئے اس وقت آپ ان سے مقابلہ کرنے کے لئے سامنے نہیں آئے بلکہ آپ نے یہ کیا کہ رات کے وقت مکان کے پچھلے دروازہ سے خاموشی کے ساتھ نکلے اور مکہ کو چھوڑ کر مدینہ کے لئے روانہ ہوگئے۔

عام ذوق کے مطابق یہ عزیمت کو چھوڑ کر رخصت کا طریقہ اختیار کرنا تھا۔ مگر یہ صحیح نہیں۔ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ وہ جوش کے بجائے ہوش کا طریقہ اختیار کرنا تھا۔ ایسے موقع پر کوئی شخص لڑ کر شہید ہو جائے تو اس نے عزیمت کا فعل نہیں کیا بلکہ اس نے نادانی کا فعل کیا۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے یہ کیا کہ غیر ضروری ٹکراؤ سے بچ کر آپ مدینہ پہنچ گئے تاکہ اپنی دعوتی مہم کو زیادہ مؤثر طور پر جاری رکھ سکیں۔ اسلام میں سر کٹانا نہیں ہے بلکہ سر کو بچانا ہے۔ اسلام میں زندگی کو مٹانا نہیں ہے بلکہ زندگی کو عمل خیر میں استعمال کرنا ہے۔

اسلام ایک فطری دین ہے۔ اسلام کی تعلیمات میں سے ایک اہم تعلیم حقیقت پسندی ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی پالیسی کو ایک لفظ میں کہنا ہو تو اس کو حقیقت پسندانہ پالیسی کہا جا سکتا ہے۔

اس معاملہ میں اسلام میں یہاں تک رعایت رکھی گئی ہے کہ اپنی قیمتی جان کو بچانے کے لئے بظاہر خلاف واقعہ بات کہنا پڑے تو اس سے بھی آدمی کو گریز نہیں کرنا چاہئے۔ وقتی دباؤ کے تحت خلاف واقعہ بات کہہ کر اپنے وجود کو بچانا اس سے زیادہ بہتر ہے کہ آدمی غیر ضروری اکڑ دکھائے اور "سچ" کہنے کے جوش میں اپنے وجود کو بے فائدہ طور پر ہلاک کر ڈالے۔

مکی دور کا ایک واقعہ اس سلسلہ میں ایک انتہائی مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ واقعہ عمار بن یاسر سے متعلق ہے جو کہ اس وقت مکہ کے ایک مشرک سردار کے غلام تھے۔ مکی دور میں ایمان لانے والوں میں جو لوگ آزاد خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے وہ مشرکین کی شدید ایذاؤں سے محفوظ رہے۔ کیونکہ ان کا قبیلہ ان کی حمایت کرنے کے لئے موجود تھا۔ لیکن جو لوگ وہاں کے سماج میں غلام کی حیثیت رکھتے تھے۔ پھر انہوں نے اسلام قبول کرلیا، وہ اپنے آقاؤں کی طرف سے ناقابل برداشت ایذارسانی کا شکار بنائے گئے۔ انہیں میں سے ایک عمار بن یاسر بھی تھے۔

عمار بن یاسر کو ان کے مشرک آقا نے شدید تکلیف پہنچائی اور کہا کہ جب تک تم ہمارے بتوں کو نہیں مانو گے اور محمد کا انکار نہیں کرو گے ہم تمہیں ستاتے رہیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے وہ خلاف حق الفاظ کہہ دیئے جو مشرکین ان سے کہلوانا چاہتے تھے۔ اس کے بعد وہ رسول اللہ کے پاس آئے اور کہا کہ میں نے مشرکین کے مطالبہ پر ایسا اور ایسا کہہ دیا۔ آپ نے پوچھا کہ تمہارے دل کا حال کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ میرا دل اسلام کی سچائی پر پوری طرح مطمئن ہے۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ مشرکین اگر تم سے دوبارہ وہ بات کہلائیں تو دوبارہ کہہ دو (ان عادوا فعد) تفسیر ابن کثیر ۲/۵۸۷-۵۸۸

قرآن کے مطابق، پیغمبر اسلام تمام انسانوں کے لئے نمونہ ہیں (الاحزاب ۲۱) جب اللہ تعالی نے آپ کو انسانوں کے لئے نمونہ بنایا تو ضروری تھا کہ آپ ایک بشر کی حیثیت سے دنیا میں زندگی گذاریں اور آپ پر وہ تمام احوال گذریں جو عام حالات میں انسانوں پر گذرتے ہیں۔ یا جو ایک عام انسان کے لئے قابل عمل ہیں۔ اگر ایسا ہو کہ رسول اللہ کو ہر وقت فرشتوں کی طاقت حاصل ہو اور وہ فوق البشر انداز میں پیش آمدہ معاملات کا مقابلہ

کریں تو وہ عام انسان کے لئے نمونہ نہیں بن سکتے۔ ایسی حالت میں یہ تکلیف مالا یطاق ہو گا کہ لوگوں سے کہا جائے کہ تم اس رسول کی پیروی کرو جو تمہاری طرح نہیں ہے۔ بلکہ اس کو غیر معمولی طاقتیں حاصل ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پوری زندگی میں اس بات کا لحاظ فرمایا کہ عام حالات میں کسی انسان کے لئے کیا چیز قابل عمل ہے اور کیا چیز قابل عمل نہیں۔ جو چیز ایک عام انسان کے لئے ممکن اور قابل عمل تھی آپ نے اس پر عمل فرمایا اور جس چیز پر عمل کرنا عام انسان کے لئے ممکن نہ تھا اس کو ترک کر دیا۔ کسی مسئلے کو حل کرنے کے لئے ہمیشہ دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ عملی حالات کی رعایت کرتے ہوئے اپنے اقدام کا منصوبہ بنایا جائے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ نتیجہ کی پرواہ کئے بغیر اس کے خلاف پر جوش اقدام کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ کی تیئیس سالہ زندگی کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے کبھی بھی دوسرا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ آپ ہمیشہ پہلے طریقہ پر کار بند رہے۔

مثال کے طور پر آپ کے زمانے میں کعبہ (بیت اللہ) کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔ آپ کا مشن یہ تھا کہ کعبہ کو ان بتوں سے پاک کیا جائے۔ آپ تیرہ سال مکہ میں رہے لیکن آپ نے کبھی ان بتوں کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ یہاں تک کہ اسی حالت پر تقریباً بیس سال گزر گئے۔ بیس سال تک آپ نے ان بتوں کے معاملے میں صرف قولی دعوت پر اکتفا فرمایا۔ بیس سال بعد جب مکہ فتح ہوا اس وقت آپ نے عملی کارروائی کر کے کعبہ کو بتوں سے پاک کر دیا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ نے قابل عمل اور نا قابل عمل کے درمیان فرق فرمایا۔ بیس سال تک بتوں کے خلاف صرف قولی تبلیغ قابل عمل تھی، اس لئے آپ قول کی

حد میں رہ کر اپنا کام کرتے رہے۔ فتح مکہ کے بعد کعبہ کی عملی تطہیر قابل عمل ہو گئی، اس لئے آپ نے عملی اقدام کر کے اس کی تطہیر فرمادی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نتیجہ خیز اقدام اور غیر نتیجہ خیز اقدام میں فرق کرنا بھی رسول اللہ ﷺ کی ایک اہم سنت ہے۔

فرق کا اصول

پیغمبر اسلام کی سیرت کے مطالعہ سے ایک اہم اصول وہ معلوم ہوتا ہے جس کو فرق کہا جا سکتا ہے۔ یعنی ایک چیز اور دوسری چیز میں فرق کو سمجھنا اور اس کے مطابق دونوں سے الگ الگ معاملہ کرنا۔ اس کی اصل قرآن کی سورۃ البقرہ آیت نمبر ۲۷۵ میں موجود ہے۔ یہ فرق فطرت کا ایک اصول ہے اور اس اصول کا لحاظ پیغمبر اسلام کی پالیسیوں میں کامل طور پر پایا جاتا ہے۔

۱۔ ان میں سے ایک قول اور عمل کا فرق ہے۔ مثلاً حدیث میں آیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ افضل جہاد ظالم حکمراں کے سامنے حق وانصاف کی بات کہنا ہے (افضل الجهاد كلمة عدل عند امير جائر) سنن ابی داود ١٢٢/٤

دوسری طرف حدیث میں کثرت سے اس قسم کی ہدایات آئی ہیں کہ حکمراں اگر ظالم ہو جائیں تب بھی تم ان کی اطاعت کرو اور ان سے ہر گز ٹکراؤ نہ کرو (مشکاۃ المصابیح ۳/۱۴۸۴)

مثلاً حضرت حذیفہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ بعد کے زمانے میں حکمرانوں میں بگاڑ آجائے گا حتی کہ تمہارے اوپر ایسے لوگ حکمراں بن جائیں گے جن کا جسم بظاہر انسان جیسا ہو گا مگر ان کے دل شیطان کی مانند ہوں گے۔ حضرت حذیفہ نے پوچھا کہ ہم ان کے مقابلے میں کیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے حاکم کی بات سنو اور اس کی

اطاعت کرو، خواہ تمہاری پیٹھ پر کوڑے مارے جائیں اور تمہارا مال تم سے لے لیا جائے پھر بھی تم سنو اور اطاعت کرو (قال تسمع وتطیع للامیر وان ضرب ظهرك واخذ مالك فاسمع واطع) صحیح مسلم بشرح النووی ۲۳۸/۱۲

مذکورہ دونوں حدیثوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔ پہلی حدیث میں ظالم حکمراں کے مقابلہ میں جہاد کی ترغیب دی گئی ہے جب کہ دوسری حدیث میں شدت کے ساتھ جہاد سے منع کیا گیا ہے۔ اس فرق کا سبب کیا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ پہلی حدیث کا تعلق قولی نصیحت سے ہے اور دوسری حدیث کا تعلق عملی ٹکراؤ سے۔ حدیث کے مطابق، قولی نصیحت ایک مطلوب عمل ہے مگر عملی ٹکراؤ سراسر غیر مطلوب عمل۔

یہاں قولی نصیحت سے مراد حکمراں کے خلاف مظاہرہ اور تقریر اور اخباری بیان نہیں ہے بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کوئی شخص جب حکمراں کے اندر کوئی بگاڑ دیکھے تو وہ اس کے حق میں دعا کرے اور پھر اس سے وقت لے کر اس سے تنہائی میں ملے اور درد مندی اور خیر خواہی کے انداز میں اس کو سمجھانے کی کوشش کرے۔ عبداللہ بن عباس سے پوچھا گیا کہ حاکم کے سامنے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کس طرح کیا جائے۔ انہوں نے جواب دیا کہ اگر تمہیں کرنا ہی ہو تو اس طرح تنہائی میں کرو کہ وہ بس تمہارے اور اس کے درمیان ہو (ففیما بینك وبینه) جامع العلوم والحکم ۷۱

۲۔ اسی طرح اسلام میں انفرادی عمل اور اجتماعی عمل کے درمیان فرق کیا گیا ہے۔ انفرادی اقدام میں ایک شخص کی زندگی خطرہ میں ہوتی ہے، جب کہ اجتماعی اقدام میں ہزاروں آدمی کی زندگی خطرہ میں آجاتی ہے۔ اسی لئے یہ عین فطری بات ہے کہ دونوں کا حکم یکساں نہ ہو۔

ہجرت کے واقعہ میں اس معاملہ میں ایک رہنما مثال پائی جاتی ہے۔ واقعات بتاتے ہیں کہ عمر بن الخطاب نے جب مکہ سے مدینہ کے لئے ہجرت کی تو انہوں نے یہ کیا کہ اپنی تلوار کو اور تیر کمان کو لیا، اور پھر کعبہ میں آئے۔ قریش کے سردار اس وقت کعبہ کے صحن میں موجود تھے۔ انہوں نے کعبہ کا طواف کیا اور دو رکعت نماز پڑھی پھر وہ اشراف قریش کے حلقوں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ تم میں جو شخص اپنی بیوی کو بیوہ اور اپنے بچوں کو یتیم کرنا چاہے وہ شہر کے باہر مجھ سے ملے۔ اس طرح وہ ہجرت کے لئے روانہ ہوئے اور کسی نے ان کا پیچھا نہیں کیا (حیاۃ الصحابہ ۱/۵۴۱)

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ نے برعکس طور پر خفیہ انداز میں ہجرت کی۔ جیسا کہ معلوم ہے، مکی دور کے تیرہویں سال قریش کے سرداروں نے دار الندوۃ میں آپ کے خلاف مشورہ کیا۔ اس کے بعد تلواروں سے مسلح ہو کر رات کے وقت آپ کے مکان کو گھیر لیا۔ آپ نے ان سے مقابلہ نہیں کیا بلکہ رات کے اندھیرے میں خاموشی سے نکل کر باہر چلے آئے۔ اس معاملے میں آپ نے اتنی زیادہ رازداری برتی کہ آپ کو مکہ سے مدینہ جانا تھا مگر مدینہ کے رخ پر جانے کے بجائے الٹی طرف جا کر غار ثور میں تین دن تک چھپے رہے اور پھر عام راستے کو چھوڑ کر غیر معروف راستے سے مدینہ کے لئے روانہ ہوئے وغیرہ۔ اس فرق کو دیکھتے ہوئے بعض سیرت نگاروں نے یہ سوال کیا ہے کہ:

لما ذاها جر عمر علانية متحديا المشركين دون اى خوف ووجل على حين هاجر رسول الله مستخفيا محتاطا لنفسه ؟ايكون عمر بن الخطاب اشد جراة من النبى عليه الصلاة السلام (فقه السيرة ١٤٤)

کیوں عمر نے اعلان کے ساتھ اور مشرکین کو چیلنج دیتے ہوئے ہجرت کی، بغیر کسی

خوف اور اندیشہ کے جب کہ رسول اللہ ﷺ نے چھپ کر اور اپنا بچاؤ کرتے ہوئے ہجرت کی۔ کیا عمر رسول اللہ سے زیادہ جرأت مند تھے۔

اس کا سبب انفرادی اقدام اور اجتماعی اقدام کا فرق ہے۔ اگرچہ اسلام میں دونوں ہی کے لئے یہ مطلوب ہے کہ جب بھی کوئی اقدام کیا جائے، ہوشمندانہ انداز میں کیا جائے، فوری جذبہ کے تحت پر جوش اقدام اسلام میں پسندیدہ نہیں۔ تاہم فرد کو اس معاملہ میں یہ اجازت ہے کہ اگر وہ چاہے تو اپنی ذات کی حد تک اس قسم کا اقدام کر سکتا ہے۔ اس کا یہ اقدام مکمل طور پر شخصی ہوگا جو دوسروں کے لئے ہرگز نمونہ نہیں۔

حضرت عمر نے جس انداز میں ہجرت کی وہ ان کا ایک ذاتی فعل تھا مگر پیغمبر اسلام ﷺ کی حیثیت محض ایک فرد کی نہیں تھی۔ وہ پوری ملت اسلامی کے قائد تھے۔ آپ کا ہر اقدام پوری امت کے لئے نمونہ کی حیثیت رکھتا تھا۔ جو کچھ آپ کریں وہی ہمیشہ کے لئے تمام مسلمانوں کو کرنا تھا۔ جب معاملہ اجتماعی اقدام کا ہو تو وہاں وہی کیا جائے گا جو رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے وقت کیا، یعنی کامل احتیاط کے ساتھ اور حالات کی پوری رعایت کرتے ہوئے اقدام کرنا۔

اس سے یہ اصول اخذ ہوتا ہے کہ کسی پیش آمدہ معاملہ میں اگر کوئی شخص اپنی ذاتی بنیاد پر ایک پر خطر اقدام کرے تو اس کو ایسا کرنے کی اجازت ہوگی۔ اگرچہ فرد کے لئے بھی اس قسم کا اقدام صرف ایک رخصت ہے نہ کہ عزیمت۔

مگر جب معاملہ جماعت کا یا امت کا ہو تو ایسی حالت میں نتیجہ کی پرواہ کئے بغیر پر خطر اقدام کرنا ہرگز جائز نہیں، فرد کے لئے بھی مذکورہ حق صرف ذاتی عمل کے درجہ میں ہے ۔ اس کے لئے بھی یہ جائز نہیں کہ وہ تقریر یا تحریر کے ذریعہ لوگوں کو پر جوش اقدام پر

بھڑکائے۔ فرد اگر قائد کی حیثیت میں ہے تو اس کو ہر حال میں جماعتی مصالح کا لحاظ کرنا ہے۔ اور اگر وہ قائد کی حیثیت میں نہیں ہے تب بھی اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان و قلم سے لوگوں کو پر خطر اقدام کے لئے اکسائے۔ ایک شخص ذاتی طور پر پر خطر اقدام کر سکتا ہے مگر دوسروں کو پر خطر اقدام پر اکسانا ہرگز اس کے لئے جائز نہیں۔

حسین کا نمونہ

نتائج کا اندازہ کئے بغیر پر جوش اقدام کی مثال رسول کے اسوہ میں موجود نہیں۔ تاہم کچھ لوگ اس کو نواسۂ رسول کے اسوہ سے درست ثابت کرتے ہیں۔ یہ حسین بن علی کے اقدام کا واقعہ ہے۔ ان لوگوں کا کہنا ہے کہ امام حسین کی طاقت بنوامیہ کی فوجوں سے بہت کم تھی اس کے باوجود جب انہوں نے حق کی پامالی کو دیکھا تو نتیجہ کی پرواہ کئے بغیر یزید کی فوجوں سے لڑ گئے اور اسی راہ میں اپنی جان دے دی۔

مگر حسین بن علی کی یہ تصویر غیر حقیقی اور سراسر خود ساختہ ہے۔ ان کی یہ تصویر شاعروں اور خطیبوں نے بنائی ہے۔ حقیقی تاریخ میں اس تصویر کا کوئی وجود نہیں۔ کسی بھی مستند تاریخ سے حسین بن علی کی یہ تصویر ثابت نہیں ہوتی۔ یہاں میں تین تاریخوں کا حوالہ دیتا ہوں۔ تاریخ طبری، الکامل فی التاریخ لابن الاثیر، البدایہ والنہایہ لابن کثیر، تینوں تاریخوں میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ حسین بن علی جب کوفہ کے قریب پہنچے اور انہیں حالات کا علم ہوا تو وہ اس کے لئے تیار ہو گئے کہ واپس ہو کر دوبارہ مکہ چلے جائیں۔

واقعات بتاتے ہیں کہ حسین بن علی جب مکہ سے روانہ ہوئے تو وہ یزید سے لڑنے کے لئے روانہ نہیں ہوئے تھے۔ ان کے قافلہ میں تقریباً ڈیڑھ سو آدمی تھے ان میں عورت اور بچے حتی کہ مریض بھی شامل تھے۔ جنگ کے لئے نکلنے والا کوئی بھی آدمی ایسے قافلہ کو

لے کر نہیں نکل سکتا۔ ان کی مکہ سے روانگی کا سبب صرف یہ تھا کہ انہیں اہل کوفہ کی طرف سے پیغام ملا تھا کہ آپ کوفہ آجائیں ہم آپ کو اپنا امام بنانے کے لئے تیار ہیں۔ اس خبر کے مطابق، وہ مکہ سے کوفہ کے لئے روانہ ہوئے۔

البدایہ والنہایہ (الجزء الثامن) میں نہایت تفصیل کے ساتھ حسین بن علی کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ اس سے واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جب کربلا کے قریب پہنچ کر ان کے علم میں یہ بات آئی کہ ان کے نمائندہ مسلم بن عقیل کو کوفہ کے اموی حاکم نے قتل کر دیا ہے اور اہل کوفہ حسین کے ساتھ اپنی وفاداری ختم کر چکے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ جہاں سے آئے تھے وہیں دوبارہ واپس چلے جائیں۔

مگر تاریخ کی قطعی شہادت کے مطابق کوفہ میں مقیم اموی فوج نے ان کا راستہ روک دیا اور ان کے قتل کے درپے ہوگئے۔ اس وقت، طبری اور دوسرے مؤرخین کی روایت کے مطابق، حسین بن علی نے اموی حاکم سے کہا کہ، اے عمر، میری طرف سے تم تین میں سے ایک بات کو قبول کرو۔ یا تو تم مجھ کو چھوڑ دو کہ میں واپس چلا جاؤں جیسا کہ میں آیا تھا، اگر تم اس کو نہ مانو تو مجھ کو یزید کے پاس لے چلو پس میں اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دوں تو وہ میرے بارے میں جو چاہے فیصلہ کرے اگر تم اس کو بھی نہ مانو تو مجھے ترک کی طرف لے چلو تاکہ میں ان سے جنگ کروں یہاں تک کہ میں مر جاؤں۔

فقال له الحسين :يا عمر اختر مني احد ى ثلاث خصال ، اما ان تتركني ارجع كما جئت ، ان ابيت هذه فسيرني الى يزيد فاضع يدي في يده فيحكم في ما راى ، فان ابيت هذه فسيرني الى الترك فا قاتلهم حتى اموت (البدا ية والنهاية لاين كثير ـ١٧٠/٨)

حقیقت یہ ہے کہ حسین بن علی کے نام پر جس خود ساختہ سیاسی جہاد کو جائز قرار دیا گیاہے اس کا حسین کے نمونہ سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ ایک مفروضہ حسین کا خیالی نمونہ ہے نہ کہ حسین بن علی کا وہ حقیقی نمونہ جو معتبر تاریخ کی کتابوں سے ثابت ہوتا ہے۔

اسٹیٹس کوازم

پیغمبر اسلام ﷺ کی پالیسی کا ایک اہم اصول اسٹیٹس کوازم تھا۔ اسٹیٹس کوازم کا مطلب حالت موجودہ کو مان لینا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام کا اسٹیٹس کوازم سادہ طور پر یہ نہیں تھا کہ جو مروجہ صورت حال ہے اس کو ہمیشہ کے لئے مان لیا جائے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ تھا کہ موجودہ ڈھانچہ سے تعرض نہ کرتے ہوئے اپنا راستہ نکالا جائے۔ یہ ایک منصوبہ بند طریق کار تھا نہ کہ کسی قسم کا جمود یا تعطل۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اس اصول کو اپنی زندگی کے مکی دور میں بھی استعمال فرمایا اور مدنی دور میں بھی۔ یہ ان اسباب میں سے ایک ہے جس کی وجہ سے آپ کو تیئیس سال کی قلیل مدت میں ایسی عظیم کامیابی ملی جو پوری تاریخ میں کبھی کسی شخص کو حاصل نہیں ہوئی۔

اس اسٹیٹس کوازم کا فائدہ یہ ہے کہ آدمی کو فی الفور کام کا موقعہ مل جاتا ہے۔ وہ اس پوزیشن میں ہو جاتا ہے کہ اپنی طاقت کا کوئی جزء ضائع کئے بغیر اس کو بھرپور طور پر اپنے مشن کے لئے استعمال کرے۔ وہ غیر ضروری ٹکراؤ سے بچتے ہوئے اپنے آپ کو آخری حد تک نتیجہ خیز عمل میں لگادے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کا مشن توحید کو قائم کرنا تھا۔ جب آپ مکہ میں مبعوث ہوئے تو اس وقت عملی صورت حال یہ تھی کہ کعبہ کے اندر تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے۔

توحید کے گھر میں بتوں کی یہ موجودگی آپ کے مشن کے سراسر خلاف تھی مگر آپ نے ان بتوں کے ساتھ عملی تعرض سے اجتناب کیا اور صرف نظری توحید کی تبلیغ میں لگ گئے۔ یہ گویا کعبہ کے مسئلہ میں اسٹیٹس کوازم کے اصول کو اختیار کرنا تھا۔

اس کا فائدہ یہ ہوا کہ آپ کو یہ موقع مل گیا کہ ۱۳ سال تک آپ لوگوں کو توحید کی بات بتاتے رہیں۔ انہیں ۱۳ سالوں کے درمیان آپ کو یہ عظیم کامیابی حاصل ہوئی کہ مکہ کے تقریباً دوسو بہترین افراد آپ کو حاصل ہو گئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہوں نے آپ کا ساتھ دے کر اسلام کی تاریخ بنائی۔

مکی دور کے آخر میں آپ کے چچا ابو طالب کا انتقال ہو گیا جو کہ بنو ہاشم کے سردار تھے۔ ان کے انتقال کے بعد آپ قبائلی حمایت سے محروم ہو گئے۔ یہاں بھی آپ نے مکہ کی موجودہ حالت کو استعمال کر کے اپنے لئے ایک حامی حاصل کیا۔ یہ مطعم بن عدی تھے۔ جیسا کہ معلوم ہے، مطعم بن عدی ایک مشرک تھے۔ مگر آپ نے یہ نہیں کہا کہ میں مشرک کی حمایت میں نہیں رہوں گا بلکہ ان کے مشرک ہونے کے باوجود ان کی حمایت کو قبول کر لیا۔ اس لئے کہ حالت موجودہ سے اس کی گنجائش نکل رہی تھی۔

ہجرت کے بعد جب آپ مدینہ پہنچے تو وہاں مسلمانوں کے ساتھ مشرک اور یہودی بھی موجود تھے۔ مگر آپ نے وہاں جو نظام بنایا اس میں یہ کوشش نہیں کی کہ پہلے مشرکوں اور یہودیوں کو مدینہ سے نکالو۔ اس کے بعد ہم یہاں اپنا نظام بنائیں گے۔ بلکہ موجود معاشرہ کی بنیاد پر ایک نظام کے قیام کا اعلان کر دیا جس کو صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس صحیفہ میں یہ لکھا ہوا تھا کہ ـــــ ہر قبیلہ کا معاملہ خود اس کی اپنی ان روایات کی بنیاد پر طے کیا جائے گا جو بروقت ان کے درمیان رائج ہیں۔

حضرت ابراہیم (اور ان کے بعد اسماعیل) نے حج کا نظام قمری کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کیا تھا جس کے سال کی مدت شمسی سال کی مدت سے کچھ کم ہوتی ہے۔ بعد کو مشرکین نے حج کے نظام کو بدل کر شمسی کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کر دیا۔ پیغمبر اسلام مامور تھے کہ اس نظام کو بدل کر دوبارہ اس کو قمری کیلنڈر کی بنیاد پر قائم کریں۔ مگر آپ نے نہ مکہ کے قیام کے زمانہ میں یہ تبدیلی لانے کی کوشش کی اور نہ فتح مکہ کے فوراً بعد اس کا نفاذ کیا۔ بلکہ آپ اس کو قائم کرنے کے لئے تقریباً پوری عمر انتظار میں رہے یہاں تک کہ بعثت کے ۲۳ویں سال جب فلکیاتی اصول کے مطابق حج کا موسم اپنے آپ ذوالحجہ کے مہینہ میں آگیا تو اس وقت حجۃ الوداع کے موقعہ پر آپ نے یہ اعلان فرمایا کہ اب ہمیشہ کے لئے حج کا فریضہ ذوالحجہ کے مہینہ میں ادا کیا جائے گا۔

یہ اسٹیٹس کوازم پیغمبر اسلام کے یہاں اتنا زیادہ پایا جاتا ہے کہ بعض امور میں آپ نے کسی معاملہ کو اس کی موجود حالت ہی پر چھوڑ دیا، یہ جانتے ہوئے کہ اب میرے بعد کوئی اس کو بدلنے والا نہ ہو گا۔

اس کی ایک واضح مثال کعبہ کے ساتھ حطیم کا مسئلہ ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ حضرت ابراہیم اور اسماعیل نے کعبہ کی صورت میں جو مسجد بنائی تھی اس میں موجودہ حطیم کا حصہ بھی شامل تھا۔ اس طرح ابراہیم کا تعمیر کردہ کعبہ لمبا تھا، جب کہ موجودہ کعبہ چوکور ہے۔ یہ چوکور کعبہ مشرکین نے بنایا تھا۔ ایک بار جب کعبہ کی قدیم عمارت گر گئی اور اس کو دوبارہ تعمیر کرنے کی ضرورت پیش آئی تو مکہ کے مشرکین نے سامان تعمیر کی کمی کی بنا پر، اس کے آدھے حصہ کو تعمیر کیا اور بقیہ آدھے کو چھوڑ دیا۔ پیغمبر اسلام کی اہلیہ عائشہؓ کہتی ہیں کہ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میں موجودہ کعبہ کو ڈھا کر اس کو دوبارہ

ابراہیمی بنیاد پر تعمیر کروں مگر تمہاری قوم ابھی جلد ہی ایمان لائی ہے، مجھے اندیشہ ہے کہ وہ اس سے بھڑک جائیں گے۔ یہ کہہ کر آپ نے کعبہ کو اس کی موجودہ حالت پر رہنے دیا۔ حالانکہ اس کا مطلب تھا کہ کعبہ ہمیشہ کے لئے بناء مشرکین پر کھڑا رہے، وہ دوبارہ کبھی ابراہیمی بنیاد پر تعمیر نہ ہو سکے (فتح الباری ۳/ ۵۱۳)

اس طرح کی بہت سی مثالیں ہیں جو یہ ثابت کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام کا طریقہ یہ تھا کہ حالت موجودہ (اسٹیٹس کو) کو چھیڑے بغیر اپنا راستہ نکالا جائے نہ یہ کہ راستہ نکالنے کے نام پر اسٹیٹس کو سے ٹکراؤ شروع کر دیا جائے۔

پیغمبر اسلام اور دیگر انبیاء

قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے پہلے بہت سے انبیاء مختلف قوموں اور علاقوں میں بھیجے گئے۔ یہ تمام انبیاء تاریخی اعتبار سے لا معلوم ہیں۔ کیونکہ ان پیغمبروں کے معاصرین نے اس زمانہ کی جو تاریخیں لکھیں ان میں انہوں نے ان پیغمبروں کے نام یا کام کا اندراج ہی نہیں کیا۔ گویا ان مورخین کے نزدیک پیغمبر اور ان کے واقعات سرے سے قابل ذکر ہی نہ تھے۔

مثلاً حضرت ابراہیم عراق میں پیدا ہوئے۔ مگر عراق کی قدیم تاریخ میں ان کا کوئی ذکر نہیں۔ حضرت موسیٰ مصر میں پیدا ہوئے۔ مگر مصر کی قدیم تاریخ حضرت موسیٰ کے تذکرہ سے خالی ہے۔ حضرت مسیح فلسطین میں پیدا ہوئے۔ مگر فلسطین کی قدیم تاریخ حضرت مسیح کا کوئی حوالہ نہیں دیتی۔ پچھلے تمام پیغمبروں کے ساتھ یہی معاملہ پیش آیا ہے۔ ان پیغمبروں کو اعتقادی طور پر تو مانا جاتا ہے مگر خالص تاریخی طور پر وہ کوئی ثابت شدہ شخصیت نہیں۔

ان میں سے کچھ پیغمبروں کا ذکر بائبل میں ملتا ہے مگر بائبل ایک اعتقادی کتاب ہے نہ کہ علمی معنوں میں کوئی تاریخی کتاب۔ مزید یہ کہ بائبل میں جن انبیاء کا ذکر ہے ان کی شخصیت کو ایسے داغدار انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ اگر بائبل کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو ان کے بارے میں یہی یقین کرنا مشکل ہو جائے گا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے۔ حتی کہ اس کے مطابق، وہ اخلاقی اعتبار سے بھی کوئی اعلیٰ نمونہ قرار نہیں پاتے۔ قرآن کی ایک حیثیت یہ ہے کہ اس نے تاریخ انبیاء کی ان گمشدہ کڑیوں کو دوبارہ معلوم واقعہ بنایا۔ انبیاء بلا شبہ تاریخ

انسانیت کے اعلیٰ ترین کردار کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ناقص تاریخ نویسی کی بنا پر ایسا ہوا کہ انسان کو بادشاہوں اور فوجی جنرلوں کے حالات تو تفصیل کے ساتھ معلوم تھے۔ مگر تاریخ کے وہ قیمتی صفحات جن کا تعلق پیغمبروں سے ہے وہ انسان کے لئے سرے سے لا معلوم بنے ہوئے تھے۔ قرآن میں پہلی بار اس بند باب کو کھولا گیا۔

قرآن میں ایسا کیوں کیا گیا۔ بظاہر یہ کافی تھا کہ قرآن میں صرف اس دین کا ذکر ہوتا جس کو پیغمبر اسلام کے ذریعہ انسانیت پر کھولنا مطلوب تھا۔ دوسرے انبیاء کا تذکرہ جس تفصیل سے قرآن میں آیا ہے اس کے پیچھے یقینی طور پر کوئی خاص مصلحت ہونی چاہئے۔

یہ مصلحت خود قرآن میں واضح طور پر بیان کر دی گئی ہے۔ قرآن کی سورہ نمبر ٦ میں تقریباً ڈیڑھ درجن نبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے نام یہ ہیں۔ ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، اسماعیل، الیسع، یونس، لوط۔ علیہم السلام (الانعام)

ان نبیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قرآن میں یہ شہادت دی گئی ہے کہ ان میں سے ہر ایک ہدایت یافتہ تھا (کلا ھدینا) ان میں سے ہر ایک محسن اور صالح تھا۔ مزید یہ کہ ان میں سے ہر ایک کو اللہ نے سارے عالم پر فضیلت دی (کلا فضلنا علی العالمین)

پچھلے نبیوں کے نام بنام تذکرہ اور ان کے بارے میں مذکورہ شہادت کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے یہ حکم دیا گیا ہے کہ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی، پس تم بھی ان کے طریقہ پر چلو (اولئك الذين هدى الله فبهدا هم اقتده)

اس صراحت سے یہ معلوم ہوا کہ قرآن میں پچھلے نبیوں کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے۔ اس کا سبب، قرآن کے بیان کے مطابق، یہ ہے کہ پیغمبر اسلام اور اسی طرح آپ کی امت

ان نبیوں کے حالات سے رہنمائی حاصل کرے۔ وہ ان کے نمونوں کو دیکھ کر یہ جانے کہ مختلف احوال کے لئے خدا کی صراط مستقیم کیا ہے اور اس پر کس طرح عمل کیا جاسکتا ہے۔

اس مطالعہ میں قرآن کی ایک اور آیت شامل کرلی جائے تو یہ بات مزید واضح ہو جائے گی۔ قرآن کی سورہ نمبر ۵ میں دوسرے نبیوں اور دوسری امتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لئے ایک شریعت اور ایک طریقہ ٹھہرایا (لكل جعلنا منكم شرعة ومنهاجا) المائدہ ٤٨

اس معاملہ کی تفصیل یہ ہے کہ خدا کا دین اگرچہ ایک ہے اور وہ توحید ہے، تاہم انسان کے احوال بدلتے رہتے ہیں، انفرادی اعتبار سے بھی اور اجتماعی اعتبار سے بھی۔ اس لئے دین کی وحدت کے باوجود اس کے عملی انطباق کے اعتبار سے اس میں فرق ہوتا رہتا ہے۔ احوال میں فرق کی بنا پر انطباق میں فرق کی یہی مصلحت ہے جس کی بنا پر مختلف نبیوں کے منہاج میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ انسانی نسل سارے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہے۔ جب کہ ہر نبی، بشمول پیغمبر آخر الزماں، ایک مخصوص خطۂ زمین میں آئے۔ اس لئے عملی طور پر یہ ناممکن تھا کہ کسی ایک نبی پر وہ سارے احوال گزریں جو وسیع تر سطح پر بنی نوع انسان کے اوپر گزرے یا آئندہ گزریں گے۔

یہی خاص مصلحت تھی جس کی بنا پر قرآن میں پچھلے نبیوں کا تذکرہ شامل کیا گیا۔ یہ انبیاء مختلف علاقوں اور مختلف قوموں میں آئے تھے۔ اس لئے فطری طور پر ان کے احوال میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ان میں سے کسی ایک نبی کو لیا جائے تو اس کے یہاں وسیع تر انسانی سماج کے صرف جزئی احوال ملیں گے۔ لیکن جب مختلف حصوں میں آنے والے نبیوں کو بیک وقت سامنے رکھا جائے تو ان کے یہاں تمام انسانی

احوال کی مثالیں پانا ممکن ہو جائے گا۔

قرآن میں تاریخ انبیاء کی گمشدہ کڑیوں کو از سر نو انسان کے علم میں لانے کا خاص سبب یہی ہے۔ اس اعتبار سے قرآن میں ان کے احوال کا تذکرہ گویا اس واقعہ کا ایک حصہ ہے جس کو قرآن میں تکمیل دین کہا گیا ہے۔ (الیوم اکملت لکم دینکم)

مختلف نبیوں کے درمیان منہاج کا فرق بر بنائے ارتقاء نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ پہلے نبیوں کو ناقص منہاج دیا گیا اور بعد کو کامل منہاج کی تعلیم دی گئی۔ یہ فرق انطباق کی بنا پر ہے نہ کہ ارتقاء کی بنا پر۔ چونکہ مختلف نبیوں کے حالات جدا جدا تھے اس لئے اس کی نسبت سے ان کے منہاج میں فرق ہو گیا۔ اگر بعد کو دوبارہ ماضی والے حالات پیدا ہو جائیں تو پچھلا منہاج اسی طرح دوبارہ اختیار کیا جائے گا جس طرح وہ پہلے اختیار کیا گیا تھا۔

قرآن میں ایک طرف پیغمبر اسلام کی ۲۳ سالہ زندگی کا ذکر ہے اور دوسری طرف پچھلے ہزاروں سال کے درمیان آنے والے انبیاء کے احوال بھی مذکور ہیں۔ یہ دونوں ہی تذکرے یکساں طور پر قرآن کا حصہ ہیں۔ ان دونوں اجزاء کے مجموعے سے ہی وہ کامل دین ترتیب پاتا ہے جس کا ذکر قرآن (المائدہ ۳) میں کیا گیا ہے۔

اس تمہید کے بعد اب چند مثالوں کی روشنی میں دیکھئے کہ پچھلے نبیوں کا تذکرہ کس طرح تکمیل دین کا ایک جزء ہے۔ اور ہر قسم کے احوال میں اہل ایمان کو متنوع رہنمائی دیتا ہے۔

۱۔ اس قسم کا نمونہ حضرت آدم کے زمانہ ہی سے ملنا شروع ہو جاتا ہے جو کہ پہلے انسان تھے اور پہلے پیغمبر بھی۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت آدم کے دو بیٹوں میں ذاتی نوعیت کا ایک جھگڑا شروع ہوا۔ یہ جھگڑا بڑھا۔ یہاں تک کہ ایک بھائی دوسرے بھائی کو

قتل کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ اس موقع پر جو صالح بھائی تھا اس کی زبان سے قرآن میں یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ اگر تم میرے قتل کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاؤ تو میں تمہارے قتل کے لئے اپنا ہاتھ نہیں بڑھاؤں گا۔ (المائدہ ۲۸)

اس سے پیغمبر اول کی شریعت معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیغمبر اول کے تربیت یافتہ ایک صالح انسان کا اسوہ کیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اسلام میں باہمی جنگ یکسر حرام ہے۔ اور اگر اہل اسلام میں باہمی جنگ کی نوبت آجائے تو دونوں فریق میں سے صالح فریق وہ ہے جو قتل ہو جائے مگر وہ اپنے بھائی کو قتل نہ کرے۔

اس اسوہ کی تصدیق خود پیغمبر اسلام کی تعلیمات سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ آپ نے باہمی جنگ سے اہل اسلام کو کلی طور پر منع فرمایا: ایک شخص نے کہا کہ اگر کوئی مسلمان مجھے قتل کرنے کے لئے آجائے تو اس وقت میں کیا کروں۔ آپ نے جواب دیا فلیکن کخیر ابنی آدم ۔ (تم آدم کے دو بیٹوں میں سے بہتر بیٹے بنو) ابوداؤد بحوالہ مشکاة المصابیح ۱۴۸۶/۳

حضرت آدم کی یہ شریعت جس کی تصدیق پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمائی، اس کا ایک عملی نمونہ خلیفۂ سوم حضرت عثمان کی زندگی میں ملتا ہے۔ جن کو کچھ مسلمانوں نے قتل کر ڈالا مگر طاقت رکھتے ہوئے انہوں نے ان مسلمانوں کے خلاف مسلح کارروائی کی اجازت نہیں دی۔

۲۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کا ذکر کرتے ہوئے اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ ان کی زندگی میں تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے (الممتحنہ ٤) اس اسوۂ حسنہ کے بہت سے پہلو ہیں یہاں ہم اس کے صرف ایک جزء کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم کی ایک دعا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانہ میں جو تہذیب رائج تھی اس نے لوگوں کے ذہن کو کامل طور پر بگاڑ دیا تھا۔ سیکڑوں سال تک فرضی معبودوں کی عبادت کرنے کے نتیجہ میں ان کا یہ حال ہو گیا تھا کہ یہ معبودان کے لاشعور کا جزء بن چکے تھے۔ حتی کہ یہ ناممکن ہو گیا تھا کہ ان معبودان باطل کی پرستش کے شہری مرکزوں میں کوئی انسان پیدا ہو اور وہ اس ماحول سے متاثر ہوئے بغیر رہ سکے۔ (سورہ ابراہیم ۳۶)

اس وقت حضرت ابراہیم نے تعمیر نسل کا ایک تاریخی منصوبہ بنایا۔ یہ ایک نئی اور محفوظ نسل کی تیاری کا منصوبہ تھا جس کی کوئی نظیر پچھلی تاریخ میں موجود نہیں۔ اس منصوبہ کے تحت آپ نے اپنے ایک چھوٹے بچے اسماعیل کو ان کی ماں کے ساتھ لے جا کر عرب کے صحرا میں بسا دیا۔ یہ اس وقت کی متمدن بستیوں سے دور ایک غیر آباد دنیا تھی۔ یہاں صرف فطرت کا ماحول تھا۔ یہاں یہ ممکن تھا کہ مشرکانہ تہذیب کے ماحول سے منقطع ہو کر ایک ایسی نسل پرورش پائے جو اپنی خداداد فطرت پر قائم ہو۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ حضرت اسماعیل نے بڑی عمر کو پہنچ کر ایک خانہ بدوش قبیلہ کی ایک صالح خاتون سے نکاح کیا۔ ان دونوں کے ملاپ سے اس صحرائی دنیا میں مطلوب نسل بننا شروع ہوئی۔ اس ماحول میں ذہن سازی یا تربیت کے لئے صرف دو چیزیں تھیں---- انسان کی پیدائشی فطرت اور خدا کی پیدا کی ہوئی وہ کائنات جس کو قرآن کے مطابق حق پر پیدا کیا گیا۔ (ابراہیم ۸۵)

اس صالح ماحول میں توالد و تناسل کے ذریعہ ایک نئی نسل کی ابتدا ہوئی۔ اس نسل کے بننے میں تقریباً ڈھائی ہزار سال لگ گئے۔ یہاں تک کہ جب وہ اپنی تکمیل تک پہنچ گئی تو اس کے اندر پیغمبر آخر الزماں ﷺ مبعوث کئے گئے۔ اسی تاریخی نسل سے وہ اعلیٰ افراد نکلے

جن کو اصحاب رسول کہا جاتا ہے ان کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی۔ قرآن میں ان کو خیر امت کہا گیا ہے۔ اور موجودہ زمانہ کے بعض مستشرقین نے ان کے غیر معمولی کارناموں کو دیکھ کر ان کو "ہیروؤں" کی ایک قوم کا لقب دیا ہے۔

حضرت ابراہیم کا یہ اسوہ بتاتا ہے کہ اگر کسی زمانہ میں یہ مسئلہ پیدا ہو کہ غیر صالح تہذیب اس طرح چھا جائے کہ بظاہر ایسا معلوم ہو کہ جو لوگ اس ماحول میں پیدا ہوں گے وہ اس کے عمومی بگاڑ سے غیر متاثر نہ رہ سکیں گے، اس وقت یہ کرنا چاہئے کہ دوبارہ زمین کا ایک ایسا گوشہ تلاش کیا جائے جہاں فاسد تہذیب کے اثرات نہ پہنچ رہے ہوں، یہاں بچوں اور نوجوانوں کو ٹھہرا کر ان کی تعلیم و تربیت کا خصوصی انتظام کیا جائے۔

اس منصوبہ کو اگر درست طور پر عمل میں لایا جائے تو حضرت ابراہیم اور بنو اسماعیل کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ فطرت کی اس تربیت گاہ سے دوبارہ اعلیٰ انسانوں کی وہ ٹیم بن کر نکل سکتی ہے جو عالمی رخ کو بدل دے۔ اور تاریخ کا سفر دوبارہ صحت مند رخ پر شروع ہو جائے۔

۳۔ اسی طرح قرآن میں ایک پیغمبرانہ قصہ وہ ہے جس کا تعلق حضرت یونس سے ہے۔ وہ عراق کے ایک قدیم شہر نینوا کی طرف بھیجے گئے وہاں کی قوم شرک میں مبتلا تھی۔ حضرت یونس نے انھیں توحید کا پیغام سنایا۔ ایک مدت تک دعوتی کام کرنے کے بعد انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ قوم ایمان لانے والی نہیں ہے اور اب وہ اس سزا کی مستحق ہو چکی ہے جو انکار توحید کے نتیجہ میں کسی قوم کے لئے مقدر ہے۔ اس فیصلہ کے بعد وہ نینوا کو چھوڑ کر اس سے باہر چلے گئے۔

مگر اس کے نتیجہ میں جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ نینوا کی قوم تو جیسی تھی ویسی ہی باقی رہی اور حضرت یونسؑ کو ایک مچھلی نے نگل لیا۔ اچانک انہوں نے اپنے آپ کو مچھلی کے پیٹ میں

پایا جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔

ایسا کیوں ہوا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ کسی قوم کا منکر توحید ہونا اس وقت ثابت ہوتا ہے جب کہ اتمام حجت کی حد تک اس کے اوپر دعوت پہنچائی جا چکی ہو۔ صرف کچھ دنوں کا دعوتی کام کسی قوم کو منکر توحید قرار دینے کے لئے کافی نہیں۔

حضرت یونسؑ نے جب اپنا محاسبہ کیا تو ان پر یہ کھلا کہ انہوں نے دعوتی عمل کی تکمیل سے پہلے اپنی قوم کو چھوڑ دیا۔ حالانکہ نبیوں کی سنت یہ ہے کہ وہ دعوتی عمل کو آخری حد تک مکمل کرنے کے بعد اپنی قوم کو چھوڑتے ہیں۔ اس احساس کے بعد انہوں نے استغفار کیا اور اللہ سے دعائیں مانگیں۔ اللہ نے ان کی دعا قبول فرمائی۔ مچھلی نے دوبارہ ان کو خشکی پر ڈال دیا۔ اس کے بعد وہ اپنی قوم میں واپس گئے۔ انھوں نے قوم کو دوبارہ توحید کی طرف بلایا اس کے بعد تقریباً پوری قوم دین توحید میں داخل ہو گئی۔

اس پیغمبرانہ واقعہ میں اہل ایمان کے لئے ایک بے حد اہم سبق ہے۔ وہ قرآن میں اس طرح آیا ہے: پھر یونس کو مچھلی نے نگل لیا اور وہ اپنے کو ملامت کر رہا تھا۔ پس اگر وہ تسبیح کرنے والوں میں سے نہ ہوتا تو لوگوں کے اٹھائے جانے کے دن تک وہ اس کے پیٹ ہی میں رہتا (الصافات ۱۴۲-۱۴۴)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دعوت کی ذمہ داری کتنی بڑی ذمہ داری ہے۔ دعوتی ذمہ داری میں کوتاہی کرنے والے کے لئے خدا کا قانون یہ ہے کہ اس کو "بطن حوت" میں ڈال دیا جائے۔ اور پھر اس وقت تک اس کو اس سے نجات نہ ملے جب تک کہ وہ توبہ کر کے اپنے دعوتی عمل کی طرف نہ لوٹے۔ بصورت دیگر وہ اس بطن میں پڑا رہے گا یہاں تک کہ قیامت آجائے۔ غور کیجئے تو یہ مثال بعینہ موجودہ امت مسلمہ پر صادق آتی ہے، یہ امت

سو سال سے زیادہ مدت سے مسائل کے بطن میں ہے، بیشمار کوششیں اور ان گنت قربانیاں بھی اس کو اس بطن سے نکالنے مین کامیاب نہ ہو سکیں، مذکورہ اسوۂ رسول کی روشنی میں اس کا واحد سبب یہ ہے کہ امت نے ایک عرصہ سے دعوت کا عمل چھوڑ رکھا ہے۔ حتیٰ کہ دعوت کا شعور تک موجودہ مسلمانوں میں نہیں ہے۔ وہ قومی تحریکیں چلاتے ہیں اور اس کا نام دعوت رکھ دیتے ہیں۔ اس امت کے لئے مسائل کے بطن سے نکلنے کی راہ صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ وہ اپنی اس غلطی کا اعتراف کرے جو غیر مسلم قوموں پر دعوت کا عمل نہ کرنے کی صورت میں اس سے ہوئی ہے۔ یہ اس کے لئے توبہ کا عمل ہوگا۔ اس توبہ کے بعد پوری امت کو یہ کرنا ہے کہ وہ از سر نو دنیا کی قوموں پر دعوتی عمل کو جاری کرے اور اس کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس کو اس کی تکمیل تک پہنچائے۔

۴۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کا قصہ بار بار بیان ہوا ہے۔ آپ کی زندگی میں بلاشبہ اہل ایمان کے لئے بہت سے سبق ہیں۔ یہاں میں ان میں سے ایک سبق کا ذکر کروں گا جس کا تجربہ مجھ کو ذاتی طور پر ہوا۔

میں نے ۱۹۴۸ میں اسلامی دعوت کا کام شروع کیا۔ مگر اس وقت یہ حال تھا کہ میں کسی مجمع میں بول نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ میں اپنی تقریر کو پیشگی طور پر لکھ لیتا اور اس کو جلسہ میں پڑھ کر سنا دیتا۔ اگر لکھی ہوئی تقریر میرے ہاتھ میں نہ ہو تو میرا یہ حال ہوتا کہ میرا دل دھڑکنے لگتا اور مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی اور میں مافی الضمیر کو الفاظ سے ادا کرنے میں قاصر ہو جاتا۔

یہ سلسلہ تقریباً پندرہ سال تک جاری رہا۔ میرے بارے میں یہ مشہور ہو گیا تھا کہ وہ جلسوں میں تقریر نہیں کرتے بلکہ مقالہ سناتے ہیں۔ ۱۹۶۲ وہ سال ہے جب کہ میں

تحریری خطاب کے دور سے نکل کر تقریری خطاب کے دور میں داخل ہوا۔

۱۹۶۲میں اعظم گڈھ کے ایک قصبہ انجان شہید میں جماعت اسلامی ہند کا ضلعی اجتماع تھا۔ مجھے اس میں بولنا تھا۔ مگر خلاف معمول میں نے اس موقع کے لئے کوئی تحریر تیار نہیں کی تھی، جب میری باری آئی تو میں دیوانگی کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ مجھے حضرت موسیٰؑ کی دعا اور خدا کی طرف سے اس کا جواب یاد آیا۔ میں نے مجنونانہ انداز میں کہا۔

قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں۔ وہ ایک زندہ رہنما ہے۔ اس میں جو واقعات بتائے گئے ہیں وہ ہم سے بھی اتنا ہی متعلق ہیں جتنا وہ اس قدیم شخصیت سے متعلق تھے جن کے حوالہ سے ان کو قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ پھر میں نے حضرت موسیٰ کا قصہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ کوئی بندۂ خدا اگر اپنے کو تقریر میں عاجز پائے اور حضرت موسیٰ کی زبان میں یہ کہہ پڑے کہ :(اللھم) یضیق صدری ولا ینطلق لسانی (الشعراء ۱۳) تو مجھے یقین ہے کہ دوبارہ خدا کی طرف سے یہ آواز آئے گی کہ :قداو تیت سؤلك یا موسی (طه۔۳٦)

یہ واقعہ میری زندگی میں نقطۂ انقلاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے بعد میرا سینہ کھل گیا اور میں بڑے بڑے جلسوں میں تقریریں کرنے لگا۔ خدا کے فضل سے یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

حضرت موسیٰ کی زندگی میں جو عظیم سبق ہمارے لئے موجود ہے اس کے سلسلے میں یہ شخصی تجربہ کی ایک مثال ہے، اسی طرح آپ کی زندگی میں سبق کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں جو قیامت تک اہل ایمان کے لئے رہنمائی کا کام دیتے رہیں گے۔

۵۔اسی طرح حضرت مسیح کا ذکر بھی قرآن میں بار بار آیا ہے۔ آپ کی زندگی اور آپ کی تعلیمات میں اہل ایمان کے لئے بہت سے نمونے ہیں۔ ان میں سے ایک نمونہ کا

ذکر یہاں کیا جاتا ہے۔ حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا۔

"میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو۔ جو تم سے عداوت رکھیں ان کا بھلا کرو، جو تم پر لعنت کریں ان کے لئے برکت چاہو، جو تمہاری تحقیر کریں ان کے لئے دعا کرو، جو تیرے ایک گال پر طمانچہ مارے دوسرا بھی اس کی طرف پھیر دے اور جو تیرا چغہ لے اس کو کرتہ لینے سے بھی منع نہ کر۔ جو کوئی تجھ سے مانگے اسے دے اور جو تیرا مال لے لے اس سے طلب نہ کر" (لوقا باب ۶ آیت ۲۷ تا ۳۰)

حضرت مسیح نے اپنے ان الفاظ میں کسی انفعالی روش کی تعلیم نہیں دی ہے، یہ دراصل آداب دعوت کا بیان ہے۔ داعی ہمیشہ یک طرفہ اخلاق کا پابند ہوتا ہے۔ داعی اگر جوابی اخلاق کا انداز اختیار کرے تو وہ معتدل فضا ہی ختم ہو جائے گی جس کے اندر دعوتی عمل جاری ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اسوہ سے بھی اس کی واضح تصدیق ملتی ہے، مثال کے طور پر حضرت صہیب رومی کے واقعہ کو لیجئے۔ انہوں نے آخری زمانہ میں مکہ سے ہجرت کی جب وہ مکہ چھوڑ کر باہر آئے تو قریش کے کچھ نوجوانوں نے انہیں پکڑ لیا، انہوں نے کہا کہ تم نے مکہ میں جو کمائی کی ہے اسے لے کر ہم تمہیں مدینہ نہیں جانے دیں گے، حضرت صہیب کے پاس اس وقت کچھ دینار تھے، انہوں نے کہا کہ اگر میں تم کو یہ سونے کے سکے دے دوں تو کیا تم مجھ کو جانے دو گے۔ نوجوانوں نے کہا کہ ہاں، اس کے بعد انہوں نے وہ دینار نکالے اور اسے نوجوانوں کے حوالہ کر دیئے، جب وہ مدینہ پہنچے اور پیغمبر اسلام ﷺ کو مذکورہ قصہ کا علم ہوا تو پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا۔ صہیب کی تجارت کامیاب رہی، صہیب کی تجارت کامیاب رہی (ربح صهيب ربح صهيب) سیرت ابن هشام ۸۹/۲

حقیقت یہ ہے کہ حضرت مسیح نے اپنے شاگردوں کو جس اخلاق کی تلقین کی وہی اہل اسلام کے لئے بھی مطلوب اخلاق ہیں۔ یہ دعوت کے وہ لازمی آداب ہیں جنھیں داعی کو اپنے مدعو کے سلسلہ میں اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس قسم کے یکطرفہ اخلاق کے بغیر دعوتی عمل کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

٦۔۔ حضرت یوسفؑ واحد پیغمبر ہیں جن کا قصہ قرآن کی ایک پوری سورہ میں بیان کیا گیا ہے (یوسف) یہ قصہ بیان کرنے کے بعد آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ غیب کی خبریں ہیں جو ہم تم کو بتارہے ہیں۔ یعنی انسانی تاریخ کا یہ ایک گم شدہ صفحہ تھا جس کو ہم نے تمہارے لئے کھولا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ اہل عقل اس سے نصیحت لیں (یوسف)

اسی طرح قصہ کے آخر میں حضرت یوسف کی زبان سے بتایا گیا ہے کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے اور صبر کرے تو اللہ ایسے محسنین اور اعلیٰ کردار کے لوگوں کے عمل کو ضائع نہیں کرتا (یوسف ٩٠) اس سے معلوم ہوا کہ حضرت یوسف کے یہاں جس کردار کی مثال ملتی ہے وہ تقوی اور صبر کے اصول کا ایک انطباق تھا۔ اور تقویٰ اور صبر کے اصول کو جہاں بھی زیر عمل لایا جائے وہاں یقینی طور پر اس کے اعلیٰ نتائج مترتب ہوں گے۔

حضرت یوسف کے مذکورہ قصہ میں عبرت و نصیحت کے مختلف پہلو ہیں۔ یہاں ہم اس کے صرف ایک پہلو کا ذکر کرتے ہیں۔

حضرت یوسف کا واقعہ مصر سے تعلق رکھتا ہے۔ اس وقت مصر میں ایک مشرک بادشاہ کی حکومت تھی۔ حضرت یوسف وہاں ایک غلام کی حیثیت سے داخل کئے گئے۔ پھر کسی سیاسی جرم کی بنا پر نہیں بلکہ بعض غیر سیاسی اسباب نے انہیں جیل تک پہنچادیا۔

اس کے بعد خواب کے ایک واقعہ نے حالات میں انقلابی تبدیلی پیدا کردی۔ بادشاہ

نے حضرت یوسف کی تعبیر خواب سے متاثر ہو کر ان کو اپنی حکومت میں ایک ایسے عہدہ کی پیش کش کی جس کو آج کل کی زبان میں وزارت غذا کہا جاسکتا ہے۔ بادشاہ کی یہ پیش کش اصلاً وزیر غذا یا وزیر زراعت کی تھی۔ مگر چونکہ یہ زرعی دور کا واقعہ ہے اور اس زمانہ میں تمام قومی معیشت زراعت ہی پر مبنی ہوا کرتی تھی، سلطنت کے تمام شعبوں میں زراعت کو کلیدی اہمیت حاصل ہوتی تھی، اس لئے عملاً ایسا ہوا کہ حضرت یوسفؑ کو بادشاہ کی سلطنت میں گویا وزیر اعظم کے عہدہ کی حیثیت حاصل ہو گئی۔

اس واقعہ کا یہ پہلو بے حد سبق آموز ہے کہ حضرت یوسف توحید کے داعی تھے (یوسف ۳۹)اس کے باوجود انہوں نے مصر میں ایک مشرک بادشاہ کی ماتحتی میں اس کی سلطنت کا ایک ذیلی عہدہ قبول کر لیا۔ یہ معاملہ کوئی غیر صحیح یا غیر معیاری معاملہ نہ تھا۔ خود قرآن کے مطابق، وہ مکمل طور پر تقویٰ اور صبر اور احسان کا ایک معاملہ تھا۔

اس سے دین توحید کا ایک اہم اصول معلوم ہوتا ہے، وہ یہ کہ موحد ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عملی معاملات میں غیر موحدین کے ساتھ کوئی اشتراک کا معاملہ نہ کیا جائے۔ توحید کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ موحدین اور غیر موحدین کے درمیان اس وقت تک نزاع جاری رہے جب تک کہ غیر موحدین کا زور ٹوٹ نہ جائے اور کامل اقتدار موحدین کے ہاتھ میں آجائے۔ حضرت یوسفؑ کی مثال اس قسم کے کسی نظریہ کی صحت کی کھلی ہوئی تردید ہے۔ اس کے برعکس درست بات یہ ہے کہ ذاتی زندگی میں توحید پر اپنے عقیدہ کو پوری طرح مضبوط رکھتے ہوئے عملی اور اجتماعی معاملات میں دوسروں سے اشتراک، اور مفاہمت کا انداز اختیار کیا جائے۔

مزید گہرائی کے ساتھ دیکھا جائے تو موجودہ زمانہ میں ہر ملک میں مسلمانوں کو جو

مصائب پیش آرہے ہیں۔ ان کا ایک بڑا سبب اس سنت یوسفی سے بے خبری ہے۔ موجودہ زمانہ میں مسلم ملکوں میں پورا امکان موجود تھا کہ مسلم رہنما ملکی حکمرانوں کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کرتے ہوئے ان کے ساتھ اشتراک کے اصول پر معاملہ کرلیں۔ اسی طرح غیر مسلم اکثریت کے ملکوں میں وہ ڈیماکریسی سے فائدہ اٹھائیں جو کہ اقتدار میں شرکت (power sharing) کا ایک نظام ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلم رہنما اگر ایسا کرتے تو ہر ملک میں مسلمانوں کے لئے ترقی کے غیر معمولی مواقع کھل جاتے۔ مگر ان رہنماؤں نے ہر ملک میں ٹکراؤ کی سیاست اختیار کی، یہ پیغمبر کی سنت سے کھلا انحراف تھا۔ اور پیغمبر کی سنت سے انحراف کا نتیجہ ابدی محرومی کے سوا اور کچھ نہیں۔

ان چند مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرآن میں مذکورہ دوسرے انبیاء کے یہاں اہل اسلام کے لئے نہایت قیمتی نمونے ہیں۔ ہمیں ان نمونوں کو اسی طرح مستند اسوۂ رسول کے طور پر لینا چاہئے جس طرح ہم پیغمبر آخر الزماں ﷺ کے نمونوں کو اپنی زندگی میں اختیار کرتے ہیں۔

سنت حدیبیہ

رسول اللہ ﷺ نے آغاز نبوت کے بعد تیرہ سال تک مکہ میں دعوت توحید کا کام کیا۔ مکہ آپ کا وطن تھا مگر مکہ والے آپ کے سخت دشمن ہوگئے۔ انہوں نے آپ کو ہر قسم کی تکلیفیں پہنچائیں۔ یہاں تک کہ وہ آپ کے قتل کے درپے ہوگئے۔ اس کے بعد آپ اور آپ کے اصحاب اللہ کے حکم سے مکہ کو چھوڑ کر مدینہ چلے گئے۔ یہ گویا ایک قسم کی جلاوطنی تھی، بظاہر حالات اس کی کوئی امید نہ تھی کہ مکہ والے دوبارہ آپ کو مکہ میں داخل ہونے کا موقع دیں گے۔ ان حالات میں ۶ ھ میں آپ نے مدینہ میں ایک خواب دیکھا کہ آپ اپنے اصحاب کے ہمراہ امن کے ساتھ مکہ میں داخل ہو رہے ہیں اور وہاں آزادانہ طور پر عمرہ اور قربانی کر رہے ہیں۔

اس خواب کے مطابق، یکم ذوالقعدہ ۶ ھ کو رسول اللہ ﷺ اور آپ کے تقریباً ڈیڑھ ہزار اصحاب مدینہ سے مکہ کے لئے روانہ ہوئے۔ یہ قافلہ خوشی خوشی آگے بڑھ رہا تھا۔ مگر جب وہ مکہ کے قریب حدیبیہ کے مقام پر پہنچا تو اہل مکہ نے ان کو روک دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کسی بھی قیمت پر آپ لوگوں کو مکہ میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں گے۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ دو ہفتہ تک حدیبیہ کے مقام پر ٹھہرے رہے۔ اس دوران اہل مکہ سے گفت و شنید جاری رہی۔ آخر کار یہ طے ہوا کہ آپ اور آپ کے اصحاب اس سال مکہ میں داخل نہ ہوں۔ بلکہ حدیبیہ سے ہی دوبارہ مدینہ واپس چلے جائیں۔ اگلے سال وہ پھر آئیں اور تین دن تک مکہ میں ٹھہریں۔ خاموشی کے ساتھ عمرہ کریں اور اس کے بعد فوراً واپس چلے جائیں۔ اس معاہدہ کے مطابق، رسول اللہ ﷺ اور

آپ کے اصحاب، پیغمبر کے خواب کے باوجود، حدیبیہ سے واپس ہو کر مدینہ چلے گئے۔ اگلے سال وہ دوبارہ آئے اور قرارداد کے مطابق انہوں نے عمرہ کیا۔

حدیبیہ کے اس واقعہ سے رسول اللہ ﷺ کی ایک خاص سنت معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ ہے۔۔۔ حالات سے غیر ضروری طور پر نہ ٹکرانا۔ کسی معاملے کو عزت و وقار کا سوال نہ بنا کر اس کو سادہ حقیقت کے طور پر دیکھنا۔ جذبات سے اوپر اٹھ کر معاملے کو سمجھنا اور فریق ثانی کی رعایت کرتے ہوئے مسئلہ کو حکیمانہ طور پر حل کرنا۔

اس پالیسی کو دوسرے لفظوں میں اسٹیٹس کوازم بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسٹیٹس کوازم کا مطلب سادہ طور پر صرف یہ نہیں ہے کہ صورت موجودہ کو بدلے بغیر اس کو مان لیا جائے۔ اسٹیٹس کوازم کوئی بے عملی نہیں، وہ عمل کی اعلیٰ ترین حکیمانہ شکل ہے۔

جب بھی دو فریقوں کے درمیان کوئی نزاع پیدا ہو تو یہ نزاع ایک خاص مقام پر آکر رک جاتی ہے۔ اب بظاہر دونوں فریق کے لئے آگے بڑھنے کی صورت صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ صورت موجودہ کو توڑیں اور اس طرح اپنے لئے آگے کا راستہ نکالیں۔

ایسے موقع پر نادان لوگ یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کو اپنے لئے وقار کا سوال بنا لیتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر میں نے صورت موجودہ کو تسلیم کر لیا تو اس سے میرا وقار مجروح ہو جائے گا۔ اپنے مفروضہ وقار کو بچانے کے لئے وہ ٹکراؤ کے طریقہ پر چل پڑتے ہیں مگر جس آدمی کے دل میں تقویٰ ہو وہ کبھی اس طرح کے معاملہ کو وقار کا مسئلہ نہیں بناتا۔ تقویٰ اس کے لئے اس بات کی ضمانت بن جاتا ہے کہ وہ ایک ایسے ٹکراؤ سے اپنے آپ کو بچالے جس کا نتیجہ مزید نقصان کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی وہ حقیقت ہے، جس کی طرف سورہ الفتح کی آیت نمبر ۲۶ میں اشارہ کیا گیا ہے۔

آدمی جب کسی نزاعی معاملہ کو وقار کا مسئلہ نہ بنائے تو اس کے اندر سنجیدہ فکر جاگ اٹھتا ہے۔ وہ اپنی غیر جذباتی سوچ کے نتیجہ میں یہ جان لیتا ہے کہ اگر میں مقام نزاع سے ہٹ جاؤں تو میرے لئے دوسرے راستے پوری طرح کھلے ہوئے ہیں۔ یہی واقعہ حدیبیہ میں پیش آیا، پیغمبر اسلام مکہ میں داخل ہونا چاہتے تھے، مگر قریش نے داخل ہونے نہیں دیا۔ قریش کی اس مخالفانہ روش کو آپ نے وقار کا مسئلہ نہیں بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ اس قابل ہو گئے کہ اسلامی قافلہ کو جنگ کے میدان سے ہٹا کر دعوت کے میدان میں سرگرم عمل کر دیں۔

صلح حدیبیہ (۶ھ) میں رسول اللہ ﷺ نے مخالفین اسلام کی شرطوں کو یک طرفہ طور پر مان کر ان سے دس سال کا ناجنگ معاہدہ کر لیا تھا۔ اس بنا پر کچھ لوگوں کو یہ معاہدہ ذلت کا معاہدہ نظر آیا (سیرۃ ابن ہشام ۳/۳۶۵) مگر جب معاہدہ مکمل ہو گیا تو قرآن میں وہ سورہ اتری جس میں اس صلح کو فتح مبین (الفتح ۱) کہا گیا تھا۔ اس فرق کا سبب یہ تھا کہ انسانوں نے اس کو حال کے اعتبار سے دیکھا اور اللہ تعالیٰ نے مستقبل کے اعتبار سے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن میں اس طرح بتائی گئی ہے: فعلم ما لم تعلموا (الفتح ۲۷)

صلح حدیبیہ اپنے آغاز میں بظاہر ذلت اور پسپائی کا معاملہ نظر آتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اس کو آئندہ ظاہر ہونے والے عملی نتیجہ کے اعتبار سے دیکھا، اس لئے اس کو کھلی ہوئی فتح قرار دیا۔ مشہور تابعی ابن شہاب الزہری کہتے ہیں:

فما فتح فی الاسلام فتح قبله كان اعظم منه ـ انما كان القتال حيث التقى الناس ـ فلما كانت الهد نة ووضعت الحرب وامن الناس بعضهم بعضا والتقوا فتفاوضوا فی الحديث والمنازعة ولم يكلم احد فی الاسلام يعقل شيئا الا دخل فيه

۔ ولقد دخل فی تینك السنتین مثل من کا ن فی الاسلام قبل ذلك او اکثر ۔ قال ابن ھشام ۔والد لیل علی قول الزھری ان رسول اللہ ﷺ خرج الی الحدیبیہ فی الف واربعماۃ فی قول جابربن عبداللہ ثم خرج عام فتح مکۃ بعد ذلك بسنتین فی عشرۃ آلاف (سیرۃ ابن ھشام ۳۷۲/۳)

حدیبیہ سے پہلے اسلام میں اتنی بڑی فتح کوئی نہیں ہوئی۔اس سے پہلے جہاں بھی وہ ایک دوسرے سے ملتے تھے تو ان کے درمیان جنگ کی نوبت آجاتی تھی۔ پھر جب ان میں مصالحت ہوئی اور لڑائی روک دی گئی اور لوگ ایک دوسرے سے امن میں ہو گئے اور باہم ملنے لگے تو ان کے درمیان آپس میں بات چیت اور تبادلۂ خیال ہونے لگا۔اس کے بعد جس شخص نے بھی اسلام کے بارے میں گفتگو کی اور وہ کچھ سمجھ رکھتا تھا تو وہ اسلام میں داخل ہو گیا۔اور صلح کے بعد دو برسوں میں اتنے لوگ اسلام میں داخل ہوئے جتنا کہ اس سے پہلے کی لمبی مدت میں داخل ہوئے تھے یا اس سے زیادہ۔ابن ہشام کہتے ہیں کہ زہری کے قول کا ثبوت یہ ہے کہ حدیبیہ کے سفر میں، جابر بن عبداللہ کی روایت کے مطابق، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک ہزار چار سو آدمی نکلے تھے۔ مگر جب آپ دو سال بعد فتح مکہ کے لئے نکلے تو آپ کے ساتھ دس ہزار آدمی تھے۔سنت حدیبیہ پیغمبر اسلام کی وہ سنت ہے جس کا نتیجہ ، قرآن کے الفاظ میں فتح مبین کی صورت میں ظاہر ہوا۔ جس نے اسلامی تحریک کو غلبہ کے دور میں داخل کر دیا۔جس کے بعد اسلام کے لئے ایسے امکانات کھلے جو اس سے پہلے اس کے حق میں نہیں کھلے تھے۔سنت حدیبیہ کیا ہے۔سنت حدیبیہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ ـــــ مسائل کو نظر انداز کیا جائے تا کہ مواقع کو استعمال کرنے کی فرصت حاصل ہو سکے۔

خدا نے اپنی دنیا کو اس طرح بنایا ہے کہ یہاں ہمیشہ عسر کے ساتھ یسر موجود رہتا ہے۔(ان مع العسر یسرا) خود نظام فطرت کے مطابق، اس دنیا میں ایسا ہے کہ جہاں مسائل ہوتے ہیں وہیں ایسے موافق مواقع بھی موجود رہتے ہیں جن کو استعمال کر کے بڑی بڑی کامیابی حاصل کی جاسکے۔ زندگی میں ناکامی کا سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ لوگ مسائل میں الجھ جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب تک رکاوٹیں ختم نہ ہوں، آگے کا سفر شروع نہیں ہو سکتا۔

مگر پیغمبر اسلام کی سنت اس سے بالکل مختلف ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنا عمل مسائل کے خلاف ٹکراؤ سے نہ شروع کیا جائے بلکہ مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے مواقع کے استعمال کی راہیں نکالی جائیں۔ حتی کہ اس اسلوب پر کار بند ہونے کے لئے اگر مخالف کی یکطرفہ شرطوں کو ماننا پڑے تو اس کو وقتی سمجھ کر اسے بھی مان لیا جائے۔

"حدیبیہ" کے نام سے جو واقعہ پیش آیا وہ ایک متعین واقعہ ہے۔ وہ بظاہر سیرتِ رسول کے بہت سے واقعات میں سے ایک واقعہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ کوئی ایک واقعہ نہیں۔ اصل یہ ہے کہ حدیبیہ کی روح پیغمبر اسلام ﷺ کی پوری زندگی میں پائی جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں جو سوچی سمجھی پالیسی اختیار کی وہ یہی حدیبیہ پالیسی تھی۔

حدیبیہ پالیسی اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ کسی صورت حال میں جو مشکلات ہوں ان کو نظر انداز کرنا اور ان مشکلات کے باوجود جو امکانات ہیں ان کو استعمال کرنا۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس پالیسی کی مثالیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ آپ نے مکی دور میں بھی اسی اصول پر عمل فرمایا اور مدنی دور میں بھی۔ حدیبیہ اور اس قسم کے دوسرے

واقعات میں صرف یہ فرق ہے کہ حدیبیہ کے موقع پر یہ پالیسی دوطرفہ اعلان کے بعد اختیار کی گئی اور دوسری مثالوں میں یکطرفہ فیصلہ کے تحت۔

رسول اللہ ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ حالات کا غیر جانب دارانہ مطالعہ کر کے خود ہی اس طریقہ پر قائم ہو جانا جس کو ہم نے حدیبیہ پالیسی کہا ہے۔ مثلاً مکہ کے ابتدائی زمانہ میں آپ نے خفیہ طور پر تبلیغ کا کام کیا۔ اس کی صورت یہ نہیں تھی کہ مکہ کے مشرکین سے اس مسئلہ پر بات چیت ہوئی اور دوطرفہ فیصلہ کے تحت یہ طے پایا کہ آپ اعلان کے ساتھ تبلیغ نہ کریں بلکہ خفیہ انداز میں تبلیغ کریں۔ اس کے بجائے آپ نے خود ہی حالات کی رعایت کرتے ہوئے خفیہ تبلیغ کا انداز اپنا لیا۔

اسی طرح بعد کو جب آپ نے اعلان کے ساتھ توحید کی دعوت دی تو اس وقت بھی یہ نہیں ہوا کہ آپ اور مشرکین مکہ اکھٹا ہوں اور اس مسئلہ پر دونوں فریقوں کے درمیان گفتگو ہو اور پھر یہ طے کیا جائے کہ آپ بیت اللہ میں رکھے ہوئے بتوں کو کوئی ضرر نہ پہنچائیں، البتہ دعوتی انداز میں اپنی بات لوگوں سے کہیں۔ بلکہ جو ہوا وہ یہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ نے خود ہی اپنے آپ کو ایک حد کا پابند بنا لیا۔ یعنی غیر اللہ کی پرستش کو چھوڑنے کا پیغام دینا مگر بیت اللہ میں رکھے ہوئے بتوں سے عملی ٹکراؤ نہ کرنا۔

اسی طرح جب آپ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو وہاں مسلمانوں کے ساتھ یہودی بھی آباد تھے۔ آپ نے ایسا نہیں کیا کہ یہود سے بات چیت کر کے یہ طے کریں کہ مدینہ میں ہم اس طرح رہیں کہ ہم تمہارے اوپر اپنا طریقہ مسلط نہیں کریں گے، بلکہ تمہیں اپنے دین کی آزادی حاصل رہے گی۔ اس کے بجائے آپ نے حالات کے جائزہ سے سمجھا کہ اپنے لئے خود ہی ایک قابل قبول حد مقرر کر لیں تا کہ یہود سے غیر ضروری ٹکراؤ نہ

پیدا ہو۔ چنانچہ مشہور صحیفۂ مدینہ میں آپ نے یہ الفاظ لکھے کہ یہود کے لئے یہود کا دین اور مسلمانوں کے لئے مسلمانوں کا دین (لليهود دينهم وللمسلمين دينهم)السيرة النبوية لابن كثير ٣٢٢/٢

حدیبیہ اسپرٹ یہ ہے کہ فریق ثانی سے نزاع کو اوائڈ کرتے ہوئے غیر نزاعی میدان میں اپنے مقصد کے حصول کی کوشش کرنا۔ یہ پالیسی صرف اس طرح چلائی جاسکتی ہے جب کہ داعی یک طرفہ طور پر فریق ثانی کو وہ رعایت دینے کے لئے راضی ہو جائے جس کو فریق ثانی اس وقت اپنا حق سمجھتا ہے۔ اس قسم کی یک طرفہ رعایت کے بغیر حدیبیہ پالیسی اختیار نہیں کی جاسکتی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آپ نے ہمیشہ ایسا ہی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے لئے یہ ممکن ہوا کہ آپ کم سے کم نقصان کو برداشت کرتے ہوئے زیادہ سے زیادہ فائدے کو حاصل کر سکیں۔

سورۃ الفرقان ایک مکی سورہ ہے۔ یہ اس دور میں اتری جب کہ پیغمبر اسلام کو صرف دعوت کا حکم دیا گیا تھا اور آپ رات دن اسی میں مصروف رہتے تھے۔ اس وقت آپ کو خطاب کرتے ہوئے کہا گیا کہ: فلا تطع الكافرين وجاهدهم به جهادا كبيرا (الفرقان ٥٢) پس تم منکروں کی بات نہ مانو اور اس کے ذریعہ سے ان کے ساتھ جہاد کبیر کرو۔

اس آیت میں ''بہ'' کی ضمیر قرآن کی طرف راجع ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ذریعہ جہاد کبیر (بڑا جہاد) کرو۔ شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے فارسی ترجمہ میں جہاد کبیر کا ترجمہ جہاد بزرگ کیا ہے۔

قرآن کوئی ''توپ و تفنگ'' کی چیز نہیں۔ اس لئے یہ آیت واضح طور پر مسلح جہاد کے لئے نہیں ہے بلکہ غیر مسلح جہاد کے لئے ہے۔ یعنی دوسرے لفظوں میں اس سے مراد

فکری اور نظریاتی جہاد ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کے ذریعہ لوگوں کے اوپر دعوتی عمل کرو۔ ہر قسم کے پر امن ذرائع کو استعمال کرتے ہوئے قرآن کو لوگوں کے لئے قابل فہم بناؤ۔ قرآن کی صداقت کے ذریعہ لوگوں کے دل ودماغ کو مسخر کرو۔ یہ آیت واضح طور پر قتال کے مقابلہ میں دعوت کی برتری کو بتاتی ہے۔ اس کے مطابق جہاد کی دو قسمیں ہیں۔ جہاد صغیر اور جہاد کبیر۔ مسلح جہاد جہاد صغیر ہے اور اس کے مقابلہ میں پر امن دعوتی جہاد جہاد کبیر۔

"حدیبیہ" اسلام کی تاریخ میں اسی جہاد کبیر کی ایک عظیم مثال ہے۔ ہجرت کے بعد منکر گروہ کی طرف سے مسلح جنگ چھیڑ دی گئی۔ مومنین اور منکرین کے گروہوں کے درمیان کئی پر تشدد مقابلے ہوئے۔ مگر وہ فیصلہ کن ثابت نہ ہو سکے کیونکہ اس وقت اصل نشانہ یہ تھا کہ مکہ دوبارہ اہل توحید کے قبضہ میں آجائے، لیکن یہ نشانہ جنگوں کے ذریعہ پورا نہ ہو سکا۔ آخر کار ہجرت کے چھٹے سال پیغمبر اسلام ﷺ نے دونوں گروہوں کے درمیان امن کا وہ معاہدہ کیا جو معاہدہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ معاہدہ گویا پر تشدد مقابلہ کے میدان سے ہٹ کر پر امن دعوتی مقابلہ کے میدان میں آنا تھا۔ یہ حدیبیہ طریق کار نہایت مؤثر ثابت ہوا۔ اس کے بعد دو سال کے اندر مکہ فتح ہو گیا اور اہل ایمان کو یہ موقع ملا کہ وہ اس بلد حرام کو دوبارہ توحید کا مرکز بنا سکیں جو صدیوں سے شرک کا مرکز بنا ہوا تھا۔

پیغمبر کی اس سنت حدیبیہ میں ہمارے لئے بہت بڑی رہنمائی ہے۔ گہرے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ زمانہ میں پھر وہی صورت حال پیش آگئی ہے جو حدیبیہ کے وقت اسلامی تحریک کے دور اول میں پیش آئی تھی۔ یہاں سنت رسول ہمیں یہ رہنمائی دے رہی ہے کہ ہم اپنے آج کے حالات میں اس پیغمبرانہ پالیسی پر عمل کریں اور دوبارہ خدا کی

طرف سے "فتح مبین" کا استحقاق حاصل کریں۔

موجودہ زمانہ کے مسلمان ایک سو سال سے بھی زیادہ لمبی مدت سے اسلامی جہاد کے نام پر دوسری قوموں سے جنگ چھیڑے ہوئے ہیں اس کا نتیجہ انہیں مزید نقصان کے سوا اور کچھ نہیں ملا۔ اب سنت رسول کا تقاضا ہے کہ وہ یک طرفہ طور پر ٹکراؤ کو ختم کردیں اور اپنی کوششوں کو اسلام اور مسلمانوں کی مثبت تعمیر کے میدان میں لگادیں۔ موجودہ مسلمانوں کے لئے اس کے سوا کامیابی کا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔

حدیبیہ پرنسپل عام معنوں میں صرف ایک "سنت" نہیں بلکہ وہ فطرت کا ایک اٹل قانون ہے۔ نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلم قومیں بھی اگر اس اصول کو استعمال کریں تو انہیں بھی اپنے دائرہ میں یہی کامیابی حاصل ہو گی۔

اس کی ایک مثال جدید جاپان کی ہے۔ دوسری عالمی جنگ کے وقت تک جاپان یہ سمجھتا تھا کہ وہ مسلح جنگ کے ذریعہ اپنے قومی مقاصد کو پورا کرسکتا ہے۔ لیکن اس جنگ میں اس کو زبردست شکست ہوئی۔ اس کی اقتصادیات تباہ ہو کر رہ گئی۔ جنگ کے بعد جاپانیوں میں نئی سوچ ابھری۔ انہوں نے اپنے آپ کو جنگ اور ٹکراؤ کے مقام سے ہٹالیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی ساری طاقت تعلیم اور تجارت اور انڈسٹری کی راہ میں لگادی۔ اس تبدیلی کا نتیجہ یہ ہوا کہ تباہ شدہ جاپان دوبارہ کھڑا ہو گیا حتی کہ اس نے ایک عالمی اقتصادی طاقت کی حیثیت حاصل کرلی۔

حدیبیہ کے واقعہ کا ذکر قرآن کی سورہ نمبر ۴۸ (الفتح) میں آیا ہے۔ حدیبیہ اسپرٹ کیا ہے، اس کو سورۃ الفتح کی اس آیت کے مطالعہ سے سمجھا جاسکتا ہے۔

جب انکار کرنے والوں نے اپنے دلوں میں حمیت پیدا کی، جاہلیت کی حمیت، پھر اللہ نے اپنی

طرف سے سکینت نازل فرمائی اپنے رسول پر اور ایمان والوں پر، اور اللہ نے ان کو تقوی کی بات پر جمائے رکھا اور وہ اس کے زیادہ حقدار اور اس کے اہل تھے۔ اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

قرآن کی یہ آیت صلح حدیبیہ کے موقع پر نازل ہوئی۔ تاہم قرآن کی دوسری آیتوں کی طرح، اس آیت کا ایک عمومی اور توسیعی مفہوم ہے۔ اس اعتبار سے اس آیت میں اسلام کی ایک ابدی تعلیم ملتی ہے۔ اس تعلیم کا تعلق اسی طرح بعد کے تمام زمانوں سے ہے جس طرح اسلام کی دوسری تعلیمات کا تعلق بعد کے زمانوں سے ہے۔

اس اعتبار سے غور کیا جائے تو اس آیت میں جو بات کہی گئی ہے وہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا میں مختلف اسباب سے ایک فرد اور دوسرے فرد یا ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان ٹکراؤ کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ ایسے موقع پر کیا کرنا چاہئے اور کیا نہیں کرنا چاہیئے، اس کو قرآن کی اس آیت میں بتایا گیا ہے۔

اس کے مطابق، نزاعی صورت حال پیش آنے کے بعد کسی فرد یا گروہ کے لئے دو قسم کی ممکن روش ہوتی ہے۔ ایک، متقیانہ روش۔ اور دوسری، غیر متقیانہ روش۔ کامیابی صرف ان لوگوں کے لئے ہے جو ایسے موقع پر متقیانہ روش اختیار کریں۔ غیر متقیانہ روش اختیار کرنے والوں کے لئے اس دنیا میں ناکامی کے سوا کوئی اور انجام نہیں۔

ایسے مواقع پر غیر متقیانہ روش کیا ہے۔ اس کو یہاں ایک لفظ میں حمیت جاہلیہ کہا گیا ہے۔ عربی میں حَمِیَ یَحْمی کے معنی ہوتے ہیں تیز گرم ہونا۔ حمی علیہ کے معنی ہیں غضبناک ہونا۔ حمیت سے مراد کسی آدمی کے اندر پیدا ہونے والی وہ کیفیت ہے جس کو غضب اور عصبیت جیسے الفاظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ نزاعی صورت حال پیدا ہونے کے بعد عام لوگ فوراً بھڑک اٹھتے ہیں۔ ان کے اندر منفی جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ وہ اس حالت میں نہیں ہوتے کہ معاملہ کو ٹھنڈے ذہن کے تحت دیکھیں اور خالص اصول کی بنیاد پر اس کو طے کریں۔ جو لوگ اس قسم کی کیفیت میں مبتلا ہوں وہ قرآن کے مطابق، حمیت جاہلیت کا شکار ہو گئے۔

اس کے مقابلہ میں دوسری روش وہ ہے جس کو قرآن میں متقیانہ روش کہا گیا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کا خوف خدا انھیں اصول پسندی کی راہ سے نہ ہٹائے۔ جو مشتعل حالات میں بھی حق اور انصاف پر قائم رہیں۔ جن کا فیصلہ دوسروں کی روش کے خلاف رد عمل کا نتیجہ نہ ہو بلکہ خود اپنے سوچے سمجھے ذہن کا نتیجہ ہو۔

قرآن کے مطابق، مذکورہ قسم کی غیر متقیانہ روش ایمان واسلام کے سراسر خلاف ہے۔ جو لوگ ایسی روش اختیار کریں وہ خدا کی اس دنیا میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے مقابلہ میں متقیانہ روش خدا پرستانہ روش ہے۔ جو لوگ اس روش کو اختیار کریں ان کے بارے میں خالق کائنات کا فیصلہ ہے کہ وہ ضرور کامیاب ہوں گے۔

اسلام کے دور اول میں حدیبیہ کا واقعہ اس معاملہ کی ایک عملی مثال ہے۔ اس واقعہ میں ایک روش وہ ہے جو مکہ کے غیر مسلموں نے اختیار کی۔ اور دوسری روش وہ ہے جو مدینہ کے اہل ایمان نے پیغمبر خدا کی قیادت میں اختیار کی۔ اب قیامت تک تمام دنیا کے انسان اس واقعہ میں اپنی اپنی تصویر دیکھ سکتے ہیں۔ جو لوگ نزاعی معاملہ میں غیر متقیانہ روش اختیار کریں وہ عملاً اپنے آپ کو غیر مسلموں کی جماعت میں شامل کر رہے ہیں، اور جو لوگ متقیانہ روش اختیار کریں انھوں نے اپنے آپ کو اہل ایمان کی جماعت میں شامل کیا۔

اس سورہ کا آغاز اس آیت سے ہوتا ہے: انا فتحنا لك فتحا مبينا (الفتح ۱)

سیاق کے اعتبار سے اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں فتح ان لوگوں کے لئے مقدر کی ہے جو مذکورہ بیان کے مطابق، معاملات میں متقیانہ روش اختیار کریں۔ اس کے بجائے جو لوگ معاملات میں غیر متقیانہ روش پر چلیں ان کے لئے خدا کی اس دنیا میں صرف مغلوبیت مقدر ہے۔ حدیبیہ کا واقعہ اس معاملہ کی ایک تاریخی مثال ہے۔ اس وقت اہل ایمان نے متقیانہ روش اختیار کی۔ چنانچہ انھیں آخر کار فتح حاصل ہوئی۔ اور قریش نے غیر متقیانہ روش اختیار کی۔ اس کا انجام یہ ہوا کہ وہ مفتوح اور مغلوب ہو کر رہ گئے۔

حدیبیہ کا واقعہ گذری ہوئی تاریخ کا واقعہ نہیں۔ وہ ایک زندہ تاریخی نمونہ ہے۔ وہ ہر دور کے خدا پرستوں کو بتاتا ہے کہ نزاعی معاملات میں وہ کون سا طریقہ ہے جو ان کی کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔ یہ ہے نزاعی معاملہ کو وقار کا سوال نہ بنانا، بلکہ اس کو تقویٰ کی اسپرٹ کے تحت حل کرنا۔

پیغمبرانہ مشن

پیغمبر اسلام ﷺ کا مشن یا نصب العین کیا تھا۔ یہ بلا شبہ نہایت اہم سوال ہے۔ اس کو علمی طور پر متعین کرنے کیلئے قرآن و سنت کا گہرا مطالعہ ضروری ہے۔ اسلامی مصادر کے گہرے مطالعہ کے بغیر اس کو درست طور پر متعین نہیں کیا جاسکتا۔ اس مطالعہ کے سلسلہ میں سب سے پہلے بنیادی رہنما اصول کا تعین بے حد ضروری ہے۔

ا۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا رہنما اصول یہ ہے کہ اس سوال کا صحیح جواب صرف وہ ہو سکتا ہے جس کو براہ راست نص کے ذریعہ اخذ کیا گیا ہو۔ استنباطی نوعیت کا استدلال اس ضمن میں ہرگز کار آمد نہیں، استنباطی استدلال یا بالواسطہ استدلال صرف جزئی یا فروعی امور میں کار آمد ہوتا ہے۔ مگر مشن یا نصب العین کا تعلق اساسی معاملے سے ہے اور اساسی معاملے میں استنباطی استدلال ہرگز کار آمد نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ پیغمبر اسلام کا مقصد اسلامی حکومت قائم کرنا تھا اور اس کی دلیل وہ قرآن کی اس آیت سے اخذ کرے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبينات وانزلنا معهم الكتب والميزان ليقوم الناس بالقسط وانزلنا الحديد فيه باس شديد ومنافع للناس وليعلم الله من ينصره ورسله بالغيب ان الله قوى عزيز(الحديد ٢٥)

ہم نے اپنے رسولوں کو نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ اتارا کتاب اور ترازو، تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔ اور ہم نے لوہا اتارا جس میں بڑی قوت ہے اور لوگوں کے لئے فائدے ہیں اور تاکہ اللہ جان لے کہ کون اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا

ہے بن دیکھے، بے شک اللہ طاقت والا، زبردست ہے۔

اس آیت سے اگر قسط اور حدید کا لفظ لے لیا جائے اور یہ کہا جائے تو درست نہ ہوگا کہ اس آیت میں یہ اسلامی مشن بتایا گیا ہے کہ حدید (ہتھیار کی طاقت) کو استعمال کر کے قسط کا نظام دنیا میں قائم کیا جائے۔

یہ استدلال علمی حیثیت سے معتبر نہیں۔ اس لئے کہ آیت کے پہلے حصہ میں قسط کا لفظ اس مفہوم میں آیا ہے کہ ہر ایک کو یہ چاہیئے کہ وہ قسط کو جان کر اپنی زندگی کو اس کے اوپر ڈھال لے۔ بالفاظ دیگر یہ ایک لازم کا صیغہ ہے مگر مذکورہ تشریح میں اس کو متعدی کے معنی میں لے لیا گیا ہے۔ یعنی "تم خود قسط پر قائم ہو" کے جملے سے یہ مفہوم اخذ کر لیا گیا ہے کہ تم دوسروں کے اوپر قسط کا نظام قائم کرو۔ اس قسم کا استدلال غیر منطقی ہے، وہ علمی اعتبار سے قابل قبول نہیں۔

۲۔ اس سلسلہ میں دوسرا اصول یہ ہے کہ پیغمبر کے مشن کا جو تصور متعین کیا جائے وہ پیغمبر کی دی ہوئی اصولی تعلیمات سے اخذ کیا جائے نہ کہ پیغمبر کے گرد بننے والی عملی تاریخ سے۔ اصولی تعلیمات ابدی ہوتی ہیں، جب کہ تاریخ سماجی یا انسانی حالات کے تحت بنتی ہے۔ اس بنا پر مشن کا تصور تاریخ کی روشنی میں نہیں بنایا جا سکتا، وہ صرف اصولی تعلیمات کی روشنی میں وضع کیا جائے گا۔

مثلاً کچھ لوگ پیغمبرانہ عمل کی ترتیب کا نقشہ اس طرح بناتے ہیں کہ۔۔۔ دعوت، ہجرت، جہاد، قیام ریاست۔ یہ تاریخ سے مشن کو اخذ کرنا ہے، قرآن وحدیث میں کہیں یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ پیغمبرانہ مشن کی ابدی ترتیب یہ ہوگی کہ پہلے دعوت دی جائے گی، پھر ہجرت ہوگی، پھر جہاد (بمعنی قتال) کیا جائے گا، اور پھر اسلامی ریاست کا قیام عمل میں آئے

گا۔ یہ ترتیب ایک تاریخی واقعہ سے نکالی گئی ہے نہ کہ قرآن وحدیث کی اصولی تعلیمات سے۔

قرآن میں اس کے برعکس یہ بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کا مشن اس طرح بھی تکمیل پذیر ہو سکتا ہے کہ "قیام ریاست" سے پہلے آپ پر موت آجائے یا آپ قتل کر دیئے جائیں (آل عمران ۱۴۴) اس آیت کی روشنی میں یہ کہنا بالکل درست ہو گا کہ اگر مدینہ یا عرب میں قیام ریاست سے پہلے آپ پر مذکورہ دو میں سے کوئی معاملہ گذر جائے تب بھی آپ کا پیغمبرانہ مشن پوری طرح مکمل ہو گا کیونکہ کوئی بھی پیغمبر اپنی مشن کی تکمیل کے بغیر دنیا سے اٹھایا نہیں جاتا۔

دوسری بات یہ کہ اس طرح کے واقعات تاریخ میں دہرائے نہیں جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نوعیت کی چہار گانہ ترتیب نہ پیغمبر اسلام سے پہلے کسی نبی کے ساتھ پیش آئی اور نہ پیغمبر اسلام کے بعد آپ کی امت کے کسی مصلح یا مجدد کے ساتھ اس کا اعادہ ہوا۔

اگر یہ ترتیب مشن کے لئے ابدی کورس کی حیثیت رکھتی ہو تو اسلام ایک وقتی اور زمانی مذہب ہو کر رہ جائے گا۔ مثلاً موجودہ نیشنل حکومتوں کے زمانہ میں ہجرت مکانی بڑے پیمانے پر سرے سے ممکن ہی نہیں۔ پھر مرحلۂ ہجرت پر کس طرح عمل کیا جائے گا، اسی طرح جہاد بمعنی اقدامی جنگ اب عملاً ممکن نہیں کیونکہ اب ساری دنیا اقوام متحدہ کے نظام کے تحت آچکی ہے۔ اقوام متحدہ کے تحت تمام ممالک، بشمول مسلم ممالک، یہ دستخط کر چکے ہیں کہ کوئی قوم کسی دوسری قوم پر حملہ نہیں کرے گی۔ اب مسلّمہ عالمی معیار کے مطابق صرف ایک ہی جنگ جائز اور ممکن ہے، اور وہ وہی جنگ ہے جو واضح طور پر دفاع کی نوعیت رکھتی ہو۔

اس طرح کے مختلف اسباب مذکورہ ترتیب کے اعادہ کو عملاً ناممکن بنا چکے ہیں۔ایسی حالت میں اس تاریخی ترتیب کو ابدی ترتیب کہنا صرف اس وقت ممکن ہے جب کہ ہم یہ بھی اقرار کریں کہ اسلامی مشن کا عملی ظہور بشری تاریخ میں صرف ایک بار ہو سکتا تھا۔اب دوسری یا تیسری بار اس کو اسی ترتیب کے ساتھ دہرانا عملی طور پر ممکن نہیں۔

۳۔اس سلسلہ میں ایک اور نہایت بنیادی چیز یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کا جو مشن متعین کیا جائے وہ عین وہی ہو جو دوسرے پیغمبروں کا مشن تھا۔ آپ کے مشن کی کوئی بھی ایسی تعبیر جو دوسرے پیغمبروں کے یہاں نہ پائی جاتی ہو وہ بلا بحث قابل رد ہے۔کیونکہ تمام انبیاء ،بشمول پیغمبر آخر الزماں،ایک ہی مشن اور ایک ہی غایت کے لئے بھیجے گئے۔

قرآن کی سورہ نمبر ۴۲ میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمہارے لئے وہی دین مقرر کیا ہے جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی وحی ہم نے تمہاری طرف کی ہے اور جس کا حکم ہم نے ابراہیم کو اور موسیٰ اور عیسیٰ کو دیا تھا کہ تم اس دین کو قائم رکھو اور اس میں فرق نہ کرو۔ مشرکین پر وہ بات بہت گراں ہے جس کی طرف تم ان کو بلا رہے ہو۔اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی طرف چن لیتا ہے۔اور وہ اپنی طرف ان کی رہنمائی کرتا ہے جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔(الشوریٰ ۱۳)

اس آیت میں پیغمبر اسلام کو مخاطب کرتے ہوئے تاریخ کے کچھ اولوالعزم، پیغمبروں کا نام لیا گیا ہے اور فرمایا گیا ہے کہ جو دین ان کو دیا گیا تھا وہی دین تم کو بھی دیا گیا ہے۔ تم اسی واحد دین کی پیروی کرو اور اس معاملہ میں تفرق کا طریقہ نہ اختیار کرو۔دوسری جگہ قرآن میں یکجا طور پر بہت سے نبیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔یہ انبیاء مختلف مقامات پر اور مختلف زمانوں میں آئے۔ان کا نام ذکر کرنے کے بعد ارشاد ہوا ہے۔

اولئك الذين هدى الله فبهدهم اقتده (الانعام ۹۱) یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، پس تم بھی ان کے طریقہ پر چلو۔

اس آیت کے مطابق، پیغمبر اسلام جن معنوں میں ہدایت یافتہ تھے، ٹھیک اسی معنی میں دوسرے پیغمبر بھی ہدایت یافتہ تھے۔ اس لئے پیغمبر اسلام کو بھی اپنے کار منصبی کو ادا کرنے کے لئے وہی فعل کرنا تھا جو دوسرے پیغمبروں نے انجام دیا۔

قرآن کے ان ارشادات کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ کے مشن کا وہی تصور درست ہو سکتا ہے جو دوسرے پیغمبروں کے مشن کے مطابق ہو، کیونکہ تمام کے تمام پیغمبر ایک ہی مشن کے لئے بھیجے گئے۔ ایسی حالت میں پیغمبر اسلام کی مشن کی کوئی ایسی تعبیر جو دوسرے انبیاء سے مختلف ہو ہرگز درست نہیں ہو سکتی۔

مثال کے طور پر اگر ایک شخص یہ کہے کہ پیغمبر کے مشن کی تکمیل کے لئے قتال ایک لازمی جزء ہے تو یہ بیان درست نہ ہوگا کیونکہ قرآن میں مذکور اکثر پیغمبروں کے یہاں قتال کا واقعہ نہیں پایا جاتا۔ اسی طرح مثلاً اگر کوئی یہ کہے کہ پیغمبر اسلام نے غیر مسلم سیاسی نظام کے تحت کوئی عہدہ قبول نہیں کیا اس لئے ایسا کرنا ایک غیر پیغمبرانہ فعل ہے تو یہ بھی درست نہ ہوگا کیونکہ قرآن سے یہ ثابت ہے کہ حضرت یوسفؑ نے مشرک بادشاہ کے تحت ایک ایسا عہدہ قبول فرمایا جس کو آج کل کی زبان میں وزارت غذا کہا جا سکتا ہے وغیرہ۔

قرآن کے مطالعہ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ تمام پیغمبروں کو ایک ہی دین دیا گیا۔ البتہ ہر ایک کی تاریخ الگ الگ بنی کیونکہ تاریخ ہمیشہ حالات کے اعتبار سے بنتی ہے۔ اس بنا پر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ پیغمبروں کی تعلیمات کی حیثیت اصولی دین کی ہے اور ان کی تاریخ اس کے مقابلہ میں دین کے اضافی جزء کی حیثیت رکھتی ہے۔

پیغمبرانہ مشن کو جاننے کے لئے قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو اس معاملہ میں سب سے زیادہ واضح آیت وہ ہے جو قرآن میں چار مقام پر آئی ہے۔ ایک جگہ حضرت ابراہیم کی دعا کے طور پر (البقرہ ۱۲۹) اور دوسرے مقامات پر عمومی انداز میں۔ آپ کی بعثت کا مقصد بتاتے ہوئے اس آیت میں ارشاد ہوا ہے۔

هو الذی بعث فی الا مین رسولا منهم یتلوا علیهم ایاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین (الجمعة ۲)

وہی ہے جس نے امیوں کے اندر ایک رسول انہیں میں سے اٹھایا، وہ ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے، اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت میں وہ پوری بات بتادی گئی ہے جو پیغمبر کو اپنے فرض منصبی کی ادائیگی کے لئے اس دنیا میں انجام دینا ہے۔ پیغمبر کا کام اصلاً یہی چار ہوتا ہے جو اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ ان چار باتوں کے علاوہ پیغمبر کی زندگی میں اور جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ انہیں چاروں چیزوں کے تحت ظاہر ہونے والے واقعات ہیں۔ مذکورہ چار چیزیں اگر پیغمبر کے مقصد بعثت سے تعلق رکھتی ہیں تو بقیہ چیزیں پیغمبر کے تاریخی احوال سے۔ اور یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ مقصد بعثت اصولی طور پر ہمیشہ ایک ہوتا ہے مگر اس مقصد کی ادائیگی کے دوران پیغمبر کے گرد جو تاریخ بنتی ہے وہ ہمیشہ مختلف ہوتی ہے، وہ کبھی یکساں نہیں ہو سکتی۔

۱۔ اس سلسلہ میں پہلی چیز تلاوت آیات ہے۔ تلاوت آیات سے مراد خدا کے دین کی عمومی دعوت ہے۔ کوئی پیغمبر جب مبعوث کیا جاتا ہے تو اس کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ حکمت اور خیر خواہی کے تمام آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے لوگوں کو خدا کا پیغام سنائے۔ وہ

لوگوں کو خدا کے منصوبہ تخلیق سے باخبر کرے۔ یہ وہی چیز ہے جس کو قرآن میں دوسری جگہ تاریکی سے نکال کر روشنی میں لانا بتایا گیا ہے۔(ویخرجهم من الظلمات الی النور) المائدہ.١٦.

تلاوت آیات سے مراد یہ نہیں ہو سکتا کہ پیغمبر لوگوں کو پورا قرآن سناتا ہے۔ کیوں کہ دعوت کا یہ عمل پیغمبر کے ظہور کے بعد ہی شروع ہو گیا، جب کہ اس وقت پورا قرآن آج کی طرح مدون صورت میں موجود ہی نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ تلاوت آیات سے مراد اساسات دین کی تبلیغ ہے یعنی توحید، رسالت اور آخرت۔ دعوت کا عمل حقیقۃً اساسات دین سے لوگوں کو باخبر کرنے کا عمل ہے۔ شریعت کے تفصیلی احکام کا خطاب ایمان لائے ہوئے لوگوں سے ہے نہ کہ ان لوگوں سے جو ابھی دائرہ ایمان میں داخل نہیں ہوئے۔

۲۔ پیغمبرانہ مشن کا دوسرا جزء وہ ہے جس کو مذکورہ آیت میں تزکیہ کہا گیا ہے۔ تزکیہ سے مراد وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں تربیت کہا جاتا ہے۔ یعنی آدمی کی ذہنی سوچ اور اس کے قلبی میلانات کو اس طرح اصلاح یافتہ بنانا کہ وہ خدائی راستہ پر یکسوئی اور قلبی اطمینان کے ساتھ چل سکے۔

تلاوت آیات میں اگر داعی کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کی بے خبری کو توڑے اور دلائل کے ساتھ ان کو اپنے پیغام کی صداقت پر مطمئن کرے تو تزکیہ کے عمل میں پیغمبر کا نشانہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کے ذہنی اتفاق کو عمل میں تبدیل کرے، وہ لوگوں کے روحانی احساس کو جگائے اور ان کے اندر حقیقی کردار کی صفت پیدا کرے۔

۳۔ پیغمبرانہ مشن کا تیسرا جزء وہ ہے جس کو قرآن میں تعلیم کتاب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ تعلیم کتاب سے مراد شریعت کے احکام و قوانین کی تعلیم ہے۔ مثلاً پہلے

مرحلے میں لوگوں سے یہ کہا گیا کہ اے لوگو، خدا ایک ہے اور وہی تمہاری عبادت کا مستحق ہے۔ دوسرے مرحلے میں ان کے اندر عبادت کی اسپرٹ پیدا کی گئی۔ اس کے بعد انھیں بتایا گیا کہ عبادت کی عملی صورت کیا ہے اور کن آداب کے ساتھ اس کو انجام دینا چاہئے۔

تعلیم کتاب کو دوسرے لفظوں میں تعلیم فقہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ وہ چیز جس کو آج فقہ اسلامی کہا جاتا ہے اس کا آغاز خود پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانے میں ہو چکا تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد لوگ آپ سے احکام و مسائل کی بابت دریافت کرتے اور آپ اس کا جواب لوگوں کو دیتے۔ تعلیم فقہ کا یہ کام صحابہ اور تابعین کے زمانہ میں بھی اسی طرح جاری رہا یہاں تک کہ عباسی دور میں تبع تابعین کے زمانہ میں اس کی باقاعدہ تدوین ہوئی۔

۴۔ پیغمبرانہ مشن کا چوتھا جزء وہ ہے جس کو قرآن میں تعلیم حکمت کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ حکمت کا لفظ ظواہر احکام کے مقابلے میں بولا جاتا ہے اس کو دوسرے لفظوں میں اسرار دین بھی کہہ سکتے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ قرآن کی ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور دوسرا اس کا باطن ہے (**لکل آیت منها ظهر وبطن**) **مشکاۃ المصابیح ۱/۸۰**

اس حدیث میں جس چیز کو آیات قرآن کا باطن کہا گیا ہے وہ دراصل آیات قرآن کی حکمتیں ہیں۔ کسی آیت (یا حدیث) کے الفاظ صرف اس کے ظاہری یا ابتدائی مفہوم کو بتاتے ہیں۔ ان الفاظ کے اندر جو گہرے معانی چھپے ہوتے ہیں وہ خود الفاظ میں موجود نہیں ہوتے۔ ان کو صرف غور و فکر کے ذریعہ جانا جاسکتا ہے۔ پیغمبر کا ایک کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کی فکری تربیت کرکے انھیں اس قابل بنائے کہ وہ دینی تعلیمات کے نہ صرف ظواہر کو

جائیں بلکہ وہ ان کے اسرار و معارف تک کو سمجھنے لگیں۔

وہ چیز جن کو دین میں اجتہاد کہا جاتا ہے اس کی صلاحیت بھی اسی تعلیم حکمت کا ایک نتیجہ ہے۔ حکمت کی تعلیم لوگوں کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ مسائل دین پر مجتہدانہ انداز میں سوچ سکیں۔ حکمت آدمی کے اندر اجتہادی بصیرت پیدا کرتی ہے۔ جن لوگوں کے اندر یہ بصیرت پیدا ہو جائے وہ ایک طرف اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اعلیٰ ایمانی سطح پر زندگی گزار سکیں۔ دوسری طرف یہی وہ لوگ ہیں جو ملت کی قائدانہ ذمہ داریوں کو پورا کرتے ہیں۔ وہ اپنے ذہن و فکر کے اعتبار سے اس قابل ہو جاتے ہیں کہ بدلے ہوئے حالات میں دین حق کی صحیح تشریح اور اس کی درست نمائندگی کر سکیں۔

مذکورہ آیت میں پیغمبرانہ مشن کے چار اجزا ٔ بتائے گئے ہیں۔ بظاہر اس میں پیغمبر کی زندگی کے کئی اور معلوم اجزا ٔ شامل نہیں مثلاً .... ہجرت، قتال، فتح، نفاذ احکام وغیرہ اس کا سبب کیا ہے، کیوں یہ بقیہ اجزا مذکورہ آیت میں چاروں میں سے کسی مقام پر موجود نہیں۔

اس کا سبب یہ ہے کہ ایک چیز ہے پیغمبر کا مشن، اور دوسری چیز ہے پیغمبر کی تاریخ۔ جو چیزیں مذکورہ آیت میں درج نہیں ہیں وہ سب پیغمبر کی تاریخ کے اجزا ٔ ہیں نہ کہ اصل مشن کے اجزا ٔ۔ مشن صرف ایک ہوتا ہے اور پیغمبر ہمیشہ اور ہر حال میں اس کو پورا کرتا ہے۔ اس کی تکمیل کے بغیر پیغمبر کا اس دنیا سے جانا ممکن نہیں۔ جہاں تک پیغمبر کی تاریخ کا معاملہ ہے اس کا تعلق وقت کے حالات سے ہے جو کبھی یکساں نہیں ہوتے۔ وہ ہمیشہ مختلف اسباب سے بدلتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف پیغمبروں کی تاریخ مختلف انداز میں بنی۔ حالانکہ سب کا مشن ایک تھا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی اصل حیثیت یہ تھی کہ آپ داعی تھے۔ قرآن میں بار بار آپ کو اسی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہاں اس سلسلہ میں صرف ایک آیت نقل کی جاتی ہے:

یاایھا النبی انا ارسلنٰك شاھدا ومبشرا ونذیرا وداعیاالی اللہ باذنه وسراجا منیراً (الاحزاب ٤٥.٤٦) اے نبی، ہم نے تم کو گواہی دینے والا اور خوش خبری دینے والا اور آگاہ کرنے والا بنا کر بھیجا۔ اور اللہ کی طرف، اس کے اذن سے، دعوت دینے والا اور ایک روشن چراغ۔

اس قسم کی آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کا مشن ایک دعوتی مشن تھا۔ آپ کا مشن اصلاً تبلیغ تھا نہ کہ کسی قسم کے سیاسی اقتدار کا قیام۔ یہ درست ہے کہ آپ کی زندگی میں دعوت و تبلیغ کے علاوہ دوسرے کچھ اجزا بھی جمع ہوئے مگر ان دوسرے اجزا کی وہی تشریح درست ہوگی جو آپ کے مشن کی دعوتی حیثیت کو مجروح نہ کرتی ہو۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پیغمبر اسلام اصلاً داعی اور مبلغ تھے۔ دوسرے اجزا جو آپ کی زندگی میں نظر آتے ہیں وہ براہ راست آپ کا نشانہ نہیں تھے بلکہ وہ دوسرے اسباب سے آپ کی زندگی میں شامل ہوئے۔

اسوۂ حسنہ

پیغمبر اسلام ﷺ نے نہ صرف نظری اعتبار سے خدا کے دین کو لوگوں کے سامنے پیش کیا بلکہ عملی طور پر خود بھی پوری طرح اس کی پیروی کی۔ اس لئے آپ بتانے والے بھی ہیں اور بتائی ہوئی بات کا عملی نمونہ دکھانے والے بھی۔ قرآن میں ارشاد ہوا ہے:

لقد كان لكم في رسول الله اسوة حسنة لمن كان يرجوا الله واليوم الآخر وذكر الله كثيراً. (الاحزاب. ٢١)

تمہارے لئے اللہ کے رسول میں بہترین نمونہ ہے اس شخص کے لئے جو اللہ کا اور آخرت کے دن کا امیدوار ہو اور کثرت سے اللہ کو یاد کرے۔

یہ آیت غزوہ احزاب (خندق) کے سیاق میں آئی ہے تاہم اصول تفسیر کے مطابق، اس کا اطلاق عام ہے۔ اپنے عمومی مفہوم کے لحاظ سے، آیت کا مطلب یہ ہے کہ نہ صرف غزوہ احزاب بلکہ ہر اعتبار سے پیغمبر کی زندگی تمہارے لئے بہترین نمونہ ہے۔ خدا کا سچا بندہ وہ ہے جو خدا کے رسول کو اپنی پوری زندگی کے لئے نمونہ بنالے۔

اسوۂ حسنہ کا مطلب، معروف معنوں میں، اسوۂ کاملہ نہیں ہے۔ بلکہ اسوۂ صحیحہ ہے۔ یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بااعتبار فہرست آپ کی زندگی میں ہر قسم کے نمونے پائے جاتے ہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بااعتبار اصول آپ نے اپنی عملی زندگی میں ان اخلاقی قدروں کا بخوبی مظاہرہ کیا ہے جو انسان کے لئے بہترین اقدار (values) کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اسوۂ حسنہ کو اگر بااعتبار فہرست اسوۂ کاملہ کے معنی میں لیا جائے تو ایسی فہرست نہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں موجود ہے اور نہ کسی ایک شخص کی زندگی میں "اس نوعیت کی

عملی جامعیت" پائی جاسکتی ہے۔ مثلاً فہرست کے نظریہ سے دیکھا جائے تو ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ آپ کی زندگی میں یتیمی کا نمونہ تو موجود ہے مگر غیر یتیمی کا نمونہ موجود نہیں، آپ کی زندگی میں یہ نمونہ تو ملتا ہے کہ لڑکیوں کے ساتھ کوئی باپ کس طرح سلوک کرے مگر کوئی باپ اپنے لڑکوں کی تربیت کس طرح کرے آپ کے یہاں اس کا ذاتی نمونہ نہیں ملے گا۔ اسی طرح کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ آپ کے یہاں نیزہ اور تلوار کے ذریعہ جنگ کا نمونہ تو ہے مگر گن اور میزائل کے ذریعہ جنگ کا نمونہ نہیں۔ آپ کے یہاں روایتی دور کے معاملات کے لئے تو نمونہ ملتا ہے مگر سائنسی دور کے معاملات کے لئے آپ کے یہاں براہ راست نمونہ موجود نہیں وغیرہ۔

رسول اللہ کی زندگی بلاشبہ کامل نمونہ ہے۔ مگر یہ کامل نمونہ اصول کے اعتبار سے ہے نہ کہ انطباق کے اعتبار سے۔ پیغمبر اسلام دراصل اخلاق کے اعلیٰ اصول بتانے کے لئے آئے۔ انھوں نے اس کے مطابق ایک بھرپور زندگی گذاری اور ہر پیش آمدہ معاملہ میں عملی نمونہ قائم کیا۔ اس طرح آپ تمام انسانوں کے لئے ایک بہترین ماڈل بن گئے۔ تاہم یہ ماڈل اصولی مفہوم میں ہے نہ کہ ہر قسم کی عملی تفصیلات کے مفہوم میں۔ مثلاً آپ نے تاجر کا نمونہ پیش کیا تو وہ صرف دیانت داری کے اعتبار سے تھا نہ یہ کہ کمپیوٹر کے دور میں تجارت کے کام کو کس طرح منظم کیا جائے۔

اس سلسلہ میں یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ آپ کے نمونہ کا تعلق ہر ہر انسانی معاملہ سے نہیں ہے بلکہ کچھ بنیادی معاملات سے ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ نے کھانے کی چیزوں میں کچھ چیزوں کو حرام بتایا اور کچھ چیزوں کو حلال قرار دیا اور حکم دیا کہ حلال چیزوں کو کھاؤ اور حرام سے پرہیز کرو۔ دوسری طرف تابیر نخل کے مشہور واقعہ میں

آپ نے فرمایا کہ: انتم اعلم بامر دنیاکم (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۱۸) دوسرے لفظوں میں یہ کہ باغبانی (horticulture) جیسے معاملات میں تم کو آزادی ہے، اپنے تجربہ اور ریسرچ کے مطابق، جو طریقہ تم کو مفید معلوم ہو اس پر عمل کرو۔

اب اس معاملہ میں ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ مذکورہ قرآنی آیت کا مطلب یہ ہے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی میں تم کو جو بھی نمونہ ملے اس کو اختیار کرلو اور اپنی زندگی میں اس کی پیروی کرو۔ لیکن گہرائی کے ساتھ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ کوئی سادہ معاملہ نہیں۔

رسول اللہ کی پیغمبرانہ عمر ۲۳ سال تھی۔ تئیس سال کی اس مدت میں تئیس سے بھی زیادہ مختلف بلکہ بظاہر متضاد نمونے پائے جاتے ہیں۔ مثلاً مکہ میں ابتداءً آپ چھپ کر نماز پڑھتے تھے مگر ۱۳ سال بعد جب آپ مدینہ پہنچے تو وہاں آپ نے اعلان کے ساتھ نماز پڑھی۔ مکی زندگی میں ۱۳ سال تک آپ کعبہ میں رکھے ہوئے بت دیکھتے تھے مگر آپ نے کبھی اس کو توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن فتح مکہ کے بعد آپ نے تمام بتوں کو توڑنے کا حکم دے دیا۔ مکی دور میں آپ صرف عقیدۂ توحید اور جنت و جہنم کی آیتیں لوگوں کو سناتے رہے بعد کو مدنی دور میں آپ نے زندگی کے مختلف پہلوؤں سے متعلق عملی احکام بھی لوگوں کو بتائے۔ مکی دور میں آپ نے کعبہ کو اپنا قبلۂ عبادت بنایا اور جب آپ مدینہ پہنچے تو تقریباً ۱۶ ماہ تک بیت المقدس کو اپنا قبلہ بنائے رہے۔ مکی دور میں آپ نے باجماعت نماز کا نظام قائم نہیں کیا مگر جب آپ مدینہ پہنچے تو وہاں آپ نے مسجد بنائی اور باجماعت نماز کا نظام قائم فرمایا۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب سوال یہ ہے کہ ان مختلف اور بظاہر متضاد نمونوں پر کس طرح عمل کیا جائے۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ ان تمام نمونوں پر ایک وقت میں عمل نہیں کیا جا سکتا، ایک نمونہ پر عمل کرنے کے لئے دوسرے نمونہ کو چھوڑنا پڑے گا۔ مثلاً پیغمبر کی زندگی میں صبر واعراض کا نمونہ بھی ہے اور جنگ و ٹکراؤ کا نمونہ بھی۔ اب کوئی بھی شخص ایسا نہیں کر سکتا کہ ایک ساتھ اور ایک وقت میں دونوں نمونوں پر عمل کرے۔ وہ جب بھی ایک کو لے گا تو لازمی طور پر اس کو دوسرا نمونہ چھوڑنا پڑے گا۔

اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ہم پیغمبر کے آخری دور کو لیں گے اور اس کے ابتدائی دور کو چھوڑ دیں گے تو یہ بلاشبہ درست نہیں۔ اس لئے کہ پیغمبر کی پوری ۲۳ سالہ زندگی ہمارے لئے نمونہ ہے نہ کہ اس کی وہ زندگی جو اس نے اپنی عمر کے آخری سال میں گذاری۔ پیغمبر کی زندگی کے واقعات میں اس قسم کی تفریق شرعی اعتبار سے بھی غلط ہے اور عقلی اعتبار سے بھی۔

قرآن کی بہت سی آیتیں جو مکہ میں اتریں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا کہ پیغمبر کی اتباع کرو۔ مثال کے طور پر الاعراف ایک مکی سورہ ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم فرمایا: کہو اے لوگو، بیشک میں اللہ کا رسول ہوں تم سب کی طرف جس کی حکومت ہے آسمانوں اور زمین میں۔ وہی جلاتا اور وہی مارتا ہے۔ پس ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے امی رسول اور نبی پر جو ایمان رکھتا ہے اللہ اور اس کے کلمات پر اور اس کا اتباع کرو تاکہ تم ہدایت پاؤ (الاعراف۔ ۱۵۸)

یہ آیت اور اس طرح کی دوسری آیتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام کی زندگی کا وہ ۱۳ سالہ دور جو مکہ میں گذرا وہ بھی پورے معنوں میں قابل اتباع ہے۔ وہ بھی اسی

طرح اسوۂ حسنہ ہے جس طرح بعد کا مدنی دور اسوۂ حسنہ ہے۔ دونوں میں اسوۂ حسنہ ہونے کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

یہ ایک بے حد غور طلب مسئلہ ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص مطلق طور پر یہ الفاظ بولے کہ جہاد تمام ملی مسائل کا حل ہے تو یہ جملہ اپنے مطلق مفہوم میں صحیح نہ ہوگا کیونکہ ایسا ماننے کی صورت میں پیغمبر کے ان تمام نمونوں کی نفی ہو رہی ہے جبکہ آپ نے جہاد (بمعنی قتال) کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا بلکہ صبر اور ہجرت جیسے طریقوں پر عمل فرمایا۔

اسی طرح اگر کوئی شخص یہ کہے کہ ملت مسلمہ کا نصب العین مکمل اسلامی نظام کا قیام ہے تو یہ بیان بھی درست نہ ہوگا کیونکہ اس میں حجۃ الوداع (۱۰ھ) سے پہلے کی پوری پیغمبرانہ زندگی محذوف اور منسوخ قرار پاتی ہے۔ جیسا کہ معلوم ہے اسلام کے کئی احکام کی تکمیل آخر میں حجۃ الوداع کے موقع پر ہوئی، اس سے پہلے نہ یہ احکام موجود تھے اور نہ قرآن کا نزول مکمل ہوا تھا، ایسی حالت میں اسوۂ حسنہ کا مطلب یہ لینا پڑے گا کہ رسول اللہ کی زندگی کا وہ آخری دور تمہارے لئے اسوۂ حسنہ ہے جبکہ قرآن مکمل طور پر نازل ہو گیا اور وہ واقعہ ظہور میں آگیا جس کو قرآن میں اکمال دین کہا گیا ہے (المائدہ۔۱)

مگر مذکورہ آیت کا ایسا مفہوم لینا شرعاً اور عقلاً دونوں اعتبار سے درست نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ کی پیغمبرانہ زندگی کی پوری مدت ہمارے لئے اسوۂ حسنہ ہے نہ کہ اس کا کوئی جزء۔ آپ کے قائم کئے ہوئے نمونوں میں سے کوئی بھی نمونہ نہ تو متروک ہے اور نہ غیر مطلوب۔

اس سوال کا یہ جواب بھی درست نہیں کہ یہ سارا معاملہ تدریج کا معاملہ ہے۔ یعنی پیغمبر اسلام کا آخری مقصود تو وہی تھا جس کا نمونہ حجۃ الوداع کے بعد آپ کی زندگی میں ملتا

ہے۔ اس سے پہلے کے جو نمونے ہیں وہ تدریج اور ترتیب کے اصول پر صرف ابتدائی مراحل کے نمونے ہیں نہ کہ آخری یا تکمیلی مرحلہ کا نمونہ۔ یہ تاویل بھی واضح طور پر غلط ہے اور خود قرآن کے بیانات صریح طور پر اس کی تردید کرتے ہیں۔

مثلاً قرآن میں رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم دیا گیا کہ تم ملت ابراہیم کی پیروی کرو (النحل۔ ۱۲۳) جیسا کہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم نے فہرست احکام کے معنی میں کوئی جامع شریعت پیش نہیں فرمائی۔ آپ کی ساری عمر دعوت توحید پر مرتکز رہی، اجتماعی احکام کا نفاذ یا حکومت کے قیام جیسے نمونے آپ کی زندگی میں سرے سے موجود ہی نہیں۔ ایسی حالت میں مذکورہ تعبیر کے مطابق، اس کا مطلب یہ قرار پاتا ہے کہ جامع شریعت والے پیغمبر کو ناقص شریعت والے پیغمبر کی اتباع کا حکم دیا جارہا ہے۔

اسی طرح قرآن میں مختلف نبیوں کا ذکر کرنے کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ سے فرمایا گیا کہ یہ سب انبیاء خدا کے راستے پر تھے، تم بھی انہی کے راستے کی پیروی کرو (الانعام۔ ۹۰)

مذکورہ صورت میں جن نبیوں کا ذکر ہے، ان کے متعلق خود قرآن کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ مذکورہ مفہوم میں "جامع شریعت" کے حامل نہ تھے بلکہ صرف توحید اور اخلاق جیسی اصولی تعلیمات ہی ان پر اتری تھیں۔ ایسی حالت میں اگر مذکورہ تعبیر کو درست مانا جائے تو دوبارہ یہ کہنا پڑے گا کہ اس آیت میں جامع شریعت والے ایک پیغمبر کو ایسے نبیوں کی پیروی کا حکم دیا گیا جن کے یہاں صرف "ناقص شریعت" کا نمونہ پایا جاتا تھا۔

تکلیف بااعتبار حالات

اصل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تئیس ۲۳ سالہ زندگی کے مختلف نمونوں میں

سے ہر نمونہ بجائے خود اسوۂ حسنہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر نمونہ اپنی ذات میں کامل نمونہ ہے۔ ہر نمونہ یکساں طور پر مطلوب نمونہ ہے۔ ایک نمونہ اور دوسرے نمونہ میں مطلوبیت کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ شریعت کے مسلمہ اصول کے مطابق، آدمی اپنے حقیقی حالات کے اعتبار سے مکلف ہے نہ کہ کسی مفروضہ آخری نصب العین کے اعتبار سے (البقرہ۔ ۲۸۶) اسلام کا مقصود یہ نہیں کہ اہل اسلام کسی خارجی نشانہ (کامل نظام اسلامی کا قیام) کو اپنا مطلق ہدف بنالیں۔ یعنی کسی آدمی کا اسلامی ہدف کیا ہو، یہ اس کے اپنے حقیقی حالات سے متعین ہوتا ہے نہ کہ خارجی طور پر وضع کئے ہوئے کسی مفروضہ نصب العین سے۔

اس تشریح کے مطابق، اسوۂ حسنہ کی آیت کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی زندگی کے نمونوں میں سے ہر نمونہ تمہارے لئے قابل اتباع ہے۔ تم کو یہ کرنا ہے کہ تم اپنے آپ کو جن حالات میں پاؤ اس کو سامنے رکھ کر پیغمبر کی زندگی کا مطالعہ کرو۔ پیغمبر کی زندگی میں ان مخصوص حالات سے مطابقت کرتا ہوا جو نمونہ بھی ملے اس کو تم مکمل طور پر اختیار کرلو۔ پیغمبر پر ہر قسم کے احوال گذرے۔ اس اعتبار سے پیغمبر کی زندگی میں ہر قسم کے احوال کے لئے نمونے موجود ہیں۔ اب خدا کے بندوں کو یہ کرنا ہے کہ وہ اپنے آپ کو جس صورت حال میں پائیں اس کو سامنے رکھ کر یہ دیکھیں کہ اس کے مماثل صورت حال جب پیغمبر پر پیش آئی تو اس وقت انھوں نے کیا روش اختیار کی تھی اور پھر اس روش کو بھر پور طور پر پکڑ لیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں نمونوں کے فرق کو عام طور پر ناسخ اور منسوخ کا معاملہ سمجھا جاتا ہے۔ جب قتال کی آیتیں اتریں تو صبر واعراض کا حکم منسوخ ہو گیا مگر نسخ کا

یہ مطلق تصور درست نہیں۔ نسخ کا مطلب حالات کے مطابق احکام کا انطباق ہے نہ کہ ایک حکم کو ابدی طور پر متروک قرار دے کر اس کی جگہ دوسرے حکم کو ابدی طور پر قائم کرنا۔ جب بھی حالات تقاضا کریں تو منسوخ حکم دوبارہ مطلوب بن جائے گا اور بعد کے دور میں بھی اس سابقہ حکم پر اسی طرح عمل کیا جائے گا جس طرح اس پر پچھلے حالات میں کیا گیا تھا۔

مثلاً (بدر ۲ھ) کے موقع پر آپ نے حکم صبر کے بجائے حکم قتال پر اس طرح عمل فرمایا کہ آپ مدینہ سے باہر نکلے اور آگے بڑھ کر بدر کے مقام پر مشرکین سے جنگ کی مگر اس کے بعد کئی مواقع پر آپ نے مشرکین کے مسلّح چیلنج کے جواب میں دوبارہ صابرانہ روش اختیار کی۔ مثلاً احزاب (۵ھ) کے موقع پر مشرکین نے مسلّح چیلنج دیا تو آپ مدینہ میں ٹھہرے رہے اور لمبی خندق کھود کر یہ تدبیر فرمائی کہ مشرکین آگے نہ بڑھ سکیں تاکہ جنگ کی نوبت ہی نہ آئے۔ یہ واضح طور پر صبر کی روش تھی نہ کہ قتال کی روش۔

بتوں کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں دو مختلف نمونے ملتے ہیں۔ مکی دور میں آپ نے کعبہ میں رکھے ہوئے بتوں کو کبھی توڑنے کی کوشش نہیں کی بلکہ عملی طور پر ان سے اعراض فرماتے رہے۔ مگر ہجرت (۸ھ) کے بعد مکہ فتح ہوا تو اس کے بعد آپ نے اس سے مختلف نمونہ قائم فرمایا یعنی تمام بتوں کو توڑ کر انہیں کعبہ سے نکال دیا۔

ان دو مختلف سنتوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کے بعد کے زمانہ میں آپ کی سنت صرف بت شکنی ہے اور بتوں سے اعراض کرنے کی سنت ہمیشہ کے لئے منسوخ ہو گئی۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب مکی دور جیسے حالات ہوں تو اس وقت آپ کی سنت بتوں سے اعراض کرنا ہوگا اور جب فتح مکہ جیسی صورت پائی جائے تو حسب حالات دوسرے نمونہ کو آپ کی سنت قرار دیا جائے گا۔

واضح ہو کہ بت شکنی اسلام کا کوئی عمومی حکم نہیں ہے۔ فتح مکہ کے بعد کعبہ کے بتوں کو توڑنا اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے بت شکنی نہیں تھی بلکہ وہ کعبہ کی تطہیر (purification) کا معاملہ تھا۔ یہ گویا کعبہ سے ناجائز قبضہ کو ختم کرنا تھا، نہ کہ حقیقۃً بتوں کو توڑنا۔

اسی طرح مثلاً آپ نے مکہ کے ابتدائی تقریباً نصف زمانہ میں بلا اعلان نماز پڑھی۔ اس کے بعد جب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو یہاں آپ نے اعلان کے ساتھ نماز پڑھنا شروع کیا۔

آپ کی ان دو سنتوں کا مطلب بھی یہ نہیں ہے کہ اب ہمیشہ کے لئے اعلان کے ساتھ نماز پڑھنا ہی آپ کی واحد سنت ہے اور بلا اعلان یا خفیہ طور پر نماز پڑھنا اب ہمیشہ کے لئے ایک منسوخ حکم بن چکا ہے۔ بلکہ حالات کے اعتبار سے دونوں ہی طریقے یکساں طور پر مطلوب ہیں، جب مدنی دور جیسے حالات ہوں تو اس وقت اعلان کے ساتھ نماز پڑھنا رسول اللہ کی سنت قرار پائے گا جو آپ نے مکی دور میں اختیار فرمایا............اسی پر دوسرے تمام نمونوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنا چاہئے کہ ان مختلف پیغمبرانہ نمونوں میں سے کوئی نمونہ نہ کمتر ہے اور نہ برتر، نہ کوئی ناقص ہے اور نہ کوئی کامل، نہ کوئی ابدی ہے اور نہ کوئی غیر ابدی۔ ہر وہ نمونہ جو پیغمبر کی زندگی میں پایا جائے وہ خود اپنے ذات میں اسوۂ حسنہ ہے۔ ہر نمونہ یکساں طور پر پیغمبر کی مطلوب سنت ہے۔ ان مختلف سنتوں میں سے اپنے حالات کے اعتبار سے جس سنت پر بھی عمل کیا جائے گا وہ پیغمبر کی کامل پیروی کے ہم معنی ہوگا اور اخلاص کی شرط کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے یہاں پورے ثواب کا مستحق قرار پائے گا۔

قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے ایمان لانے والو، اطاعت میں پوری طرح داخل ہو جاؤ (البقرہ ۲۰۸) اس آیت کے مطابق ہر شخص سے اسلام کی کامل پیروی مطلوب

ہے۔ مگر کامل پیروی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیک وقت تمام احکام کی مجموعی پیروی کرو یا یہ کہ تمام احکام کی مجموعی پیروی کو نشانہ بنا کر اس کے لئے نظام اسلامی کے نفاذ کی تحریک چلاؤ۔ اس آیت کا مطلب صرف یہ ہے کہ باعتبار حالات تم جس حکم اسلام کے مخاطب بن رہے ہو، اس کو اختیار کرنے میں کوئی کمی نہ کرو۔ اس کی پیروی میں کسی کوتاہی کا ہرگز ارتکاب نہ کرو۔

مثلاً آدمی ایسے حالات میں ہے جہاں نماز کی ادائیگی آزادانہ طور پر ممکن ہے تو ایسے حالات میں نماز کا وقت آنے کے بعد نماز کی باقاعدہ ادائیگی اس پر ضروری ہوگی۔ اسی طرح اہل اسلام اگر ایسے حالات میں ہیں جہاں انھیں دعوت دین کا عمل کرنے کی آزادی ہے تو ان کے اوپر لازم ہوگا کہ وہ دعوت کی ادائیگی میں پوری طرح مصروف ہوں، وہ تمام ضروری تدبیروں کو کام میں لاتے ہوئے حسن وخوبی کے ساتھ کامل طور پر دعوت کا عمل انجام دیں۔ اسی طرح حالات وقت کے مطابق اگر ان کے لئے یہ مواقع موجود ہیں کہ وہ مسلمانوں کو معروف کی تاکید کریں اور اگر کوئی مسلمان کسی منکر کا ارتکاب کرے تو حسب حالات انفرادی یا اجتماعی طور پر اس کو ارتکاب منکر سے روکنے کی کوشش کریں، ایسے حالات کی موجودگی میں تمام مسلمانوں پر حسب استعداد اس فریضہ کی کامل ادائیگی بھی ضروری ہوگی وغیرہ۔

خلاصہ یہ کہ ”کامل پیروی“ کا تعلق فہرست احکام سے نہیں ہے بلکہ اس مخصوص اور متعین حکم سے ہے جو بر وقت اہل اسلام پر شرعاً عائد ہو رہا ہو۔ بالفاظ دیگر، اس سے مراد ہر ایک سنت نبوی کی کامل پیروی ہے نہ کہ تمام نبوی سنتوں کی مجموعی پیروی۔

ختم نبوت

اسلامی عقیدہ کے مطابق، محمد ﷺ پر نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب دنیا میں خدا کی طرف سے کوئی اور نبی بھیجا جانے والا نہیں۔ یہ عقیدہ قرآن وحدیث میں واضح طور پر بار بار بیان ہوا ہے۔ براہ راست انداز میں بھی اور بالواسطہ انداز میں بھی۔ اس سلسلہ میں قرآن کی ایک براہ راست آیت یہ ہے۔

ما کان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول اللہ وخاتم النبین و کا ن اللہ بکل شئی علیما ۔(الاحزاب ٤٠)

محمد تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں ہیں لیکن وہ اللہ کے رسول اور نبیوں کے خاتم ہیں۔ اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

خاتم کے معنی سیل (seal) کے ہیں۔ یہاں اس سے مراد وہی عمل ہے جس کو عام طور پر مہر بند کرنا کہتے ہیں۔ ایک چیز ہے اسٹیمپ اور دوسری چیز ہے سیل، اسٹیمپ کسی عبارت کے آخر میں تصدیق کے لئے ہوتی ہے، اور سیل اس کو آخری طور پر مہر بند کرنے کے لئے۔ جب کسی تحریر کو لفافہ میں رکھ کر اس کو بند کیا جائے اور لفافے کے اوپر خاتمہ کی مہر لگائی جائے تو اس کو سیل کرنا کہتے ہیں۔

اس آیت میں خاتم سے مراد یہی سیل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ محمد ﷺ نبیوں کی سیل ہیں۔ آپ کی آمد سلسلہ نبوت کو منقطع کر دیتی ہے۔

کسی چیز کو سیل کرنے کا مطلب اس کو آخری طور پر بند کرنا ہے کہ اس کے بعد نہ کوئی چیز اس کے اندر سے باہر نکلے اور نہ باہر سے کوئی چیز اس کے اندر جائے۔ چنانچہ عربی

میں قوم کا خاتم قوم کے آخری شخص کو کہا جاتا ہے۔ یعنی وہ شخص جس کے بعد فہرست میں کسی اور شخص کا نام باقی نہ رہے (خاتم القوم آخرہم)

یہاں خاتم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب محمد ﷺ کی مہر (اسٹیمپ) کی تصدیق سے انبیاء آئیں گے۔ جیسا کہ غلط طور پر کچھ مدعیان نبوت کہتے ہیں۔ یہ مفہوم عربی زبان وادب کے سراسر خلاف ہے۔

مزید یہ کہ اگر کوئی ایسا دعوی کرے تو خود محمد ﷺ کا اعلان اس کے دعوی کی کھلی تردید کر رہا ہے کیونکہ آپ نے ثابت شدہ طور پر یہ فرمادیا کہ میرے اوپر نبوت ختم ہو گئی، اب قیامت تک کوئی اور نبی آنے والا نہیں۔ یہ بات متواتر روایات سے ثابت ہے۔ اس سلسلہ میں یہاں چند حدیثیں نقل کی جاتی ہیں۔

ان الرسالة والنبوة قد انقطعت فلا رسول بعدی ولانبی (احمد والترمذی) رسالت اور نبوت منقطع ہو گئی پس میرے بعد نہ کوئی رسول ہے اور نہ کوئی نبی۔

جئت فختمت الانبیاء علیهم السلام(مسلم) میں آیا پس میں نے نبیوں کی آمد کا سلسلہ ختم کر دیا۔

ختم بی الا نبیاء علیهم الصلاة والسلا م (البخاری) مجھ پر نبیوں کا خاتمہ ہو گیا۔

ختم بی النبیون (الترمذی) مجھ پر نبیوں کی آمد ختم ہو گئی۔

انا العاقب الذی لیس بعد ہ نبی (صحیحین) میں عاقب ہوں جس کے بعد کوئی نبی نہیں۔

انا محمد النبی الامی ولانبی بعدی (احمد) میں محمد ہوں امی پیغمبر، اور میرے بعد کوئی

نبی نہیں۔

مفسر ابن کثیر نے اس سلسلہ کی روایتوں کو تفصیل کے ساتھ جمع کر دیا ہے۔ وہاں انہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ ہو تفسیر ابن کثیر جلد ۳، صفحہ ۴۹۳۔ ۴۹۴

سورۃ الاحزاب کی مذکورہ آیت کے علاوہ قرآن میں اور بھی ایسی آیتیں ہیں جو بالواسطہ انداز میں اس بات کا ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد اب نہ کوئی نبی آنے والا ہے اور نہ خدائی منصوبہ کے مطابق کسی اور نبی کی ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں ایک آیت یہ ہے۔

الیوم یئس الذین کفروا من دینکم فلا تخشوھم واخشون الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا (المائدہ ۳) آج انکار کرنے والے تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو گئے۔ پس تم ان سے نہ ڈرو، صرف مجھ سے ڈرو۔ آج میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تمہارے اوپر اپنی نعمت پوری کر دی اور تمہارے لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔

"آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا" یعنی تم کو جو احکام دئے جانے تھے وہ سب دے دیئے گئے۔ تمہارے لئے جو کچھ بھیجنا مقدر تھا وہ سب بھیجا جا چکا۔ یہاں مطلق معنوں میں دین کے کامل کئے جانے کا ذکر نہیں ہے بلکہ امت محمدی پر جو قرآن نازل ہونا شروع ہوا تھا اس قرآن کے پورے ہونے کا اعلان ہے۔ یہ نزول کی تکمیل کا ذکر ہے نہ کہ دین کی تکمیل کا۔ اسی لئے الفاظ یہ نہیں ہیں کہ "آج میں نے دین کو کامل کر دیا" بلکہ یہ فرمایا کہ "آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لئے کامل کر دیا" حقیقت یہ ہے کہ خدا کا دین ہر زمانہ میں اپنی کامل صورت میں انسان کو دیا گیا ہے۔ خدا نے کبھی ناقص دین انسان

کے پاس نہیں بھیجا۔

قرآن کو ماننے والی امت کو خدا نے اتنی مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیا ہے کہ وہ اپنی امکانی قوت کے اعتبار سے ہر بیرونی خطرہ کی زد سے باہر جا چکی ہے۔ اب اگر اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اندرونی کمزوریوں کی وجہ سے نہ کہ خارجی حملوں کی وجہ سے۔ اور اندرونی کمزوریوں سے پاک رہنے کی سب سے بڑی ضمانت یہ ہے کہ اس کے افراد اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔

اس آیت میں "اکمال دین" سے مراد فہرست احکام کی تکمیل نہیں ہے، یعنی اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں سے متعلق جو ممکن احکام ہیں وہ سب کے سب پیغمبر آخرالزماں پر اتار دئے گئے۔ اس آیت میں **اکملت لکم دینکم** سے مراد احکام و مسائل کی تکمیل نہیں ہے بلکہ اس سے مراد دین کا استحکام ہے۔ یعنی اب خدا کا دین مستحکم بنیادوں پر قائم ہو چکا ہے۔ اس کا یہ استحکام اتنا زیادہ مکمل ہے کہ وہ اہل انکار یا اہل باطل کی ہر سازش کی زد سے باہر آ چکا ہے۔ اب قیامت تک کسی کی مخالفانہ تدبیریں اس کو نقصان پہنچانے والی نہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں صحیح قول وہ ہے جس کو مفسر النسفی نے اپنی تفسیر میں درج کیا ہے۔ انہوں نے اس آیت کے تحت لکھا ہے:

(اکملت لکم دینکم) بان کفیتم خوف عدوکم واظهرتکم علیهم کما یقول الملوك الیوم کمل لنا الملك ای کفینا من کنا نخافه (تفسیر النسفی ۱/ ۲۷۰)

(میں نے تمہارے دین کو کامل کر دیا) اس طرح کہ تم کو تمہارے دشمن کے خوف سے محفوظ کر دیا۔ اور تم کو ان کے اوپر غالب کر دیا۔ جس طرح بادشاہ کہتے ہیں کہ آج ہمارا

اقتدار مستحکم ہو گیا۔ یعنی جن سے ہمیں خوف تھا ان سے ہم محفوظ ہو گئے۔

یہ آیت بالواسطہ انداز میں ختم نبوت کا ایک اعلان ہے۔ کسی نئے نبی کی آمد اس وقت ہوتی ہے جب پچھلے پیغمبر کے ذریعہ آیا ہوا دین اصل صورت میں موجود نہ رہے۔ دنیا خدا کی سچی رہنمائی (نہ کہ کامل رہنمائی) سے محروم ہو گئی ہو، اب جب کہ دین کا استحکام اس بات کی ضمانت بن گیا کہ کوئی بھی سازش یا مخالفانہ تدبیر خدا کے دین کی حقیقی صورت کو بگاڑ نہ سکے تو ایسی حالت میں کسی نئے نبی کے آنے کی ضرورت سرے سے باقی نہیں رہتی۔

موجودہ زمانہ میں بعض خود ساختہ مدعیان نبوت اٹھے اور انھوں نے نیا مذہب بنایا مثلاً بہاء اللہ (وفات ۱۸۹۲) اور ہندستان کے مرزا غلام احمد قادیانی (وفات ۱۹۰۸) ان لوگوں نے اپنے نبوت کے حق میں مشترک طور پر یہ دلیل دی کہ اب زمانہ بدل گیا ہے، انسانیت روایتی دور سے نکل کر سائنسی دور میں یا دستکاری کے دور سے آگے بڑھ کر مشینی دور میں داخل ہو گئی ہے۔ اس بنا پر یہ ضرورت پیش آگئی کہ انسان کو بدلے ہوئے حالات کے مطابق از سر نو رہنمائی دی جائے۔ اس مقدمے کی بنیاد پر انھوں نے دعوی کیا کہ ہم کو خدا نے اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے نبی بنایا ہے۔ اور اپنا کلام ہمارے اوپر اتارا ہے۔

یہ دلیل سراسر بے بنیاد اور غیر متعلق ہے۔ یہ بات بجائے خود درست ہے کہ موجودہ زمانہ میں تمدن اور ٹکنالوجی کے اعتبار سے بہت زیادہ تبدیلیاں ہوئی ہیں مگر ان چیزوں کا کوئی بھی تعلق وحی و نبوت سے نہیں ہے۔

تمدنی اسباب وذرائع کا تعلق ان چیزوں سے ہے جن کے متعلق پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا کہ: انتم اعلم بامر دنیا کم (تم اپنی دنیا کے معاملہ کو زیادہ جانتے ہو) صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۱۸

خدا کا پیغمبر زندگی کے اصول بتانے کے لئے آتا ہے۔ وہ تمدنی اسباب وذرائع کو بتانے کے لئے نہیں آتا۔ اس لئے تمدنی ترقی کے حوالے سے نئے پیغمبر کی آمد پر دلیل لانا سراسر بے بنیاد بات ہے، اس کا تعلق نہ شریعت سے ہے اور نہ عقل سے۔

سر ظفر اللہ خاں ایک قادیانی تھے، انھوں نے قادیانیت کی حمایت میں ایک انگریزی کتاب لکھی ہے۔ وہ مرزا غلام احمد کو دور حاضر کا نبی مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ موجودہ زمانہ ایک بدلا ہوا زمانہ ہے اور اس بدلے ہوئے زمانے میں خدا کی رہنمائی حاصل کرنے کے لئے دوبارہ ایک نبی کی ضرورت ہے۔ مرزا غلام احمد اسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اٹھائے گئے۔

یہ استدلال محض ایک مغالطہ ہے۔ نبی کا تعلق زمانہ کی تبدیلی سے نہیں ہے بلکہ اس بات سے ہے کہ خدائی متن محرف یا غیر موجود ہو گیا ہو۔ زمانہ ہمیشہ بدلتا رہتا ہے اور زمانے کی تبدیلی کے اعتبار سے ضرورت ہوتی ہے کہ دین حق کی دوبارہ تشریح کی جائے۔ مگر تشریح نو کا یہ کام علماء اور مجتہدین انجام دیتے ہیں۔ اس کے لئے نئے نبی کی بعثت کی کوئی ضرورت نہیں۔

جیسا کہ معلوم ہے، قرآن کامل طور پر اپنی اصل حالت میں آج بھی موجود ہے۔ اس کے متن میں کسی بھی قسم کی کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور جب خدا کا کلام قرآن کی صورت میں محفوظ ہے تو نئے نبی کی آمد کا بھی کوئی سوال نہیں۔

اس معاملہ کی ایک مثال یہ ہے کہ موجودہ زمانہ کے مدعیان نبوت نے یہ کہا کہ موجودہ صنعتی دور میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں ان میں سے ایک مسئلہ مشترک سماج کا ہے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں ساری دنیا میں نقل وحرکت بڑھ گئی اس کے نتیجہ میں ایک نئی

صورت حال پیدا ہوئی جبکہ کسی ایک ملک میں کئی مذہب کے لوگ آکر آباد ہوگئے۔ اس طرح اکثر ملکوں میں مشترک مذہبی سماج (ملٹی ریلیجس سوسائٹی) قائم ہو گئی۔ انھوں کہا کہ اسلام میں واحد مذہبی سماج (یونی ریلیجس سوسائٹی) کے احکام تو موجود ہیں مگر مشترک مذہبی سماج کے احکام موجود نہیں۔ اس نئی ضرورت کا تقاضا ہے کہ دوبارہ ایک نبی آئے جو اس مسئلہ کے بارے میں خدائی احکام کو بتائے۔

ان مدعیان نبوت نے اس مسئلہ کا حل یہ بتایا کہ صداقت ہر مذہب میں پائی جاتی ہے اور اس کا اشارہ خود قرآن کی اس آیت میں موجود ہے وانہ لفی زبرالاولین (الشعراء. ١٩٦) انھوں نے کہا کہ چونکہ صداقت ہر مذہب میں موجود ہے اس لئے ہر مذہب والوں کو دوسرے مذہب پر اسی طرح اعتقاد رکھنا چاہیئے جس طرح وہ خود اپنے مذہب پر اعتقاد رکھتے ہیں۔

مگر یہ کوئی ایسا مسئلہ نہیں جس کے بارے میں خدائی حکم بتانے کے لئے کسی نئے نبی کی آمد ضروری ہو جائے۔ پہلی بات یہ ہے کہ اس سوال کا واضح جواب خود پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت میں موجود ہے۔ آپ جب مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو اس وقت وہاں مسلمانوں کے ساتھ یہودی اور مشرکین بھی موجود تھے گویا اس وقت مدینہ ایک مشترک مذہبی سماج کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ نے یہ کیا کہ ایک منشور جاری فرمایا جس کو عام طور پر صحیفۂ مدینہ کہا جاتا ہے۔ اس میں پیغمبر اسلام کی انتظامی قیادت کو مانتے ہوئے یہ کہا گیا تھا کہ ہر مذہبی گروہ کے معاملات اس کی اپنی مذہبی اور قبائلی روایات کے مطابق طے کئے جائیں گے۔ اس سے یہ اصول ملتا ہے کہ مشترک سماج کی تنظیم اس طرح کی جائے گی کہ مرکزی

انتظام زیادہ تر اکثریتی گروہ کے ہاتھ میں ہوگا مگر اسی کے ساتھ ہر مذہبی یا کلچرل گروہ کو یہ حق ہوگا کہ وہ اپنے عقائد کے مطابق اپنے داخلی معاملات کی تنظیم کر سکیں۔

دوسری بات یہ کہ مشترک سماج میں پر امن ماحول پیدا کرنے کا مسئلہ بجائے خود کوئی مذہبی مسئلہ نہیں۔ یہ اس سے الگ ایک مسئلہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اگر ہر مذہبی گروہ دوسرے مذہب والوں کو سچا سمجھنے لگے تو وہاں امن قائم ہو جائے گا۔ امن پسندانہ زندگی کے لئے اصل میں جس چیز کی اہمیت ہے وہ ٹالرنس (رواداری) کا جذبہ ہے۔ جس سماج کے لوگوں کے اندر ٹالرنس کا جذبہ ہو وہاں امن ہوگا اور جہاں ٹالرنس کا جذبہ نہ ہو وہاں ٹکراؤ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ ٹکراؤ کے واقعات مشترک اور غیر مشترک دونوں قسم کے سماج میں یکساں طور پر باقی رہتے ہیں۔ مثلاً مہابھارت کی لڑائی خود ہندوؤں کے دو گروہوں کے درمیان ہوئی، دوسری عالمی جنگ جن دو فریقوں کے درمیان ہوئی وہ دونوں کے دونوں عیسائی تھے۔ افغانستان اور دوسرے ملکوں میں خود مسلمان دو گروہ بن کر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں وغیرہ۔ اس معاملہ کا خلاصہ ایک لفظ میں یہ ہے کہ سماجی امن کا راز باہمی اعتراف (mutual recognition) میں نہیں ہے بلکہ باہمی احترام (mutual respect) میں ہے۔

یہ مسئلہ مشترک اعتقاد کا نہیں ہے۔ بلکہ مشترک احترام کا ہے۔ اسلام میں اس مسئلہ کا یہی حل بتایا گیا ہے۔

قرآن میں اور بھی متعدد آیتیں ہیں جن کا تعلق اسی ختم نبوت کے مسئلہ سے ہے۔ اس سلسلے میں ایک متعلق آیت یہ ہے۔

ومن الليل فتهجد به نافلة لك عسى أن يبعثك ربك مقاماً

محمودا (بنی اسرائیل ۷۹)

اور رات کو تہجد پڑھو۔ یہ نفل ہے تمہارے لئے۔ امید ہے کہ تمہارا رب تم کو مقام محمود پر کھڑا کرے۔

مقام محمود کے لفظی معنی ہیں تعریف کیا ہوا مقام۔ اس محمودیت کا ایک دنیوی پہلو ہے اور ایک اس کا اخروی پہلو۔ اخروی پہلو وہ ہے جس کو مفسرین شفاعت کبریٰ کہتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث سے معلوم ہوتا ہے، قیامت کے دن تمام انبیاء، اپنے مومنین کی شفاعت کریں گے۔ یہ شفاعت گویا ان کے مومن ہونے کی تصدیق ہوگی جس کے بعد ان لوگوں کو جنت میں داخل کیا جائے گا جن کو خدا جنت میں داخل کرنا چاہے۔ رسول اللہ ﷺ کی شفاعت سب سے بڑی ہوگی۔ کیونکہ اپنے امتیوں کی تعداد سب سے زیادہ ہونے کی وجہ سے آپ سب سے بڑے گروہ کی شفاعت فرمائیں گے۔

رسول اللہ ﷺ کی محمودیت کا دنیوی پہلو یہ ہے کہ آپ کے ساتھ ایسی تاریخ جمع ہو جائے کہ آپ تمام اقوام عالم کی نظر میں مسلمہ طور پر قابل ستائش اور لائق اعتراف بن جائیں۔ خدا کا یہ منصوبہ آپ کے حق میں مکمل طور پر پورا ہوا۔ آج دنیا کے تمام لوگ آپ کا اعتراف کرنے پر مجبور ہیں۔ آپ کی نبوت ایک مسلم نبوت بن چکی ہے نہ کہ نزاعی نبوت جیسا کہ وہ آپ کے ظہور کے ابتدائی سالوں میں تھی۔

محمودی نبوت، دنیوی اعتبار سے مسلمہ (established) نبوت کا دوسرا نام ہے۔ یعنی ایسی نبوت جس کے حق میں تاریخی شہادتیں اتنی زیادہ کامل طور پر موجود ہوں کہ آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیمات کے بارہ میں کسی کے لئے شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ انسان خود اپنے مسلمہ علمی معیار کے مطابق آپ کی حیثیت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جائے۔ اقرار یا

اعتراف کی آخری صورت تعریف وستائش ہے اس لئے اس کو "مقام محمود" کہا گیا۔

مقام محمود کی یہ آیت مکی دور کے آخر میں اتری اس وقت اسلام مستحکم نہیں ہوا تھا۔ بعد کو اللہ تعالیٰ نے حالات میں ایسی تبدیلیاں پیدا کیں کہ دین اسلام ہر اعتبار سے کامل طور پر مستحکم ہو گیا............ قرآن اس طرح محفوظ ہو گیا کہ اب اس میں تحریف یا تبدیلی کا کوئی امکان نہیں، سنت نبوی کتابوں میں مدون ہو گئی، پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت خالص تاریخی معیار پر ایک مسلم اور معترف شخصیت بن گئی۔ ایک عظیم امت اور بے شمار ادارے دین اسلام کی حفاظت پر قائم ہو گئے وغیرہ وغیرہ۔

جب خدا کا دین اس طرح محفوظ اور مستحکم ہو جائے تو پیغمبر کی ذاتی موجودگی کے بغیر بھی یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ خدا کے دین کو پوری طرح سمجھا جا سکے اور اس پر عمل کیا جا سکے۔ اس طرح کے واقعات پیش آنے کے بعد انسانیت جہل کے اندھیرے میں نہیں رہتی بلکہ علم کے اجالے میں آجاتی ہے۔ کسی بھی طالب کے لئے خدا کی مرضی کو جاننا پوری طرح سہل اور ممکن ہو جاتا ہے یہی مقصد پیغمبر کی بعثت کا ہے اور جب مقصد بعثت حاصل ہو رہا ہو تو نیا نبی آخر کس لئے بھیجا جائے۔

فطرت پر اعتماد

محمد ﷺ اپنے ۲۳ سالہ عمل کے ذریعہ عرب میں جو انقلاب لائے اس کا نتیجہ صرف یہی نہیں ہوا کہ قدیم سیاسی نظام بدل گیا۔ اس سے زیادہ بڑا واقعہ وہ تھا جو انسانی سوچ کی سطح پر پیش آیا۔ جو لوگ اس سے پہلے مشرک تھے وہ موحد بن گئے۔ جو لوگ سرکش تھے وہ مطیع فرمان بن گئے۔ جن کی سوچ مقامی حدود میں بند تھی وہ بین اقوامی پیغام کے علمبردار بن گئے۔ جن کو لڑنے بھڑنے کے سوا کچھ اور نہ آتا تھا وہ امن اور انسانیت کے مبلغ بن کر دنیا میں پھیل گئے۔ جن کی خود اپنی کوئی تاریخ نہ تھی انھوں نے اٹھ کر اقوام عالم کی تاریخ بنائی۔

محمد ﷺ اس قسم کا انوکھا انقلاب لانے میں کس طرح کامیاب ہوئے۔ دوبارہ اس کا جواب یہی ہے کہ اس نوعیت کا انقلاب لانے کے لئے ایک بہت بڑی قربانی درکار ہے۔ یہ قربانی وہی ہے جس کو آج کل کی زبان میں رسک لینا کہا جاسکتا ہے۔ اس دنیا کا اصول یہ ہے کہ .... ’’جتنا بڑا رسک اتنی بڑی کامیابی‘‘ انسان کو بدلنا اس دنیا کا مشکل ترین کام ہے، اس لئے جو شخص انسانوں کو بدلنا چاہے اس کو بھی مشکل ترین رسک لینا پڑتا ہے۔ عالم اسباب کے اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ محمد ﷺ نے اس معاملہ میں آخری درجہ کا رسک لیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کو آخری درجہ کی کامیابی حاصل ہوئی۔

یہاں اس بات کی وضاحت کے لئے دو مثالیں نقل کی جاتی ہیں۔ پہلی مثال وہ ہے جب کہ مکہ فتح ہوگیا۔ مکہ کے لوگوں کی اکثریت اب بھی مشرک تھی۔ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے آپ کے ساتھ سخت ترین دشمنی کی تھی۔ انھوں نے آپ کو آپ کے وطن سے

نکالا تھا۔ انھوں نے آپ کے خلاف جارحانہ لڑائیاں کی تھیں۔ انھوں نے آپ کے بہت سے ساتھیوں کو قتل کیا تھا اور خود آپ پر ایک سے زیادہ بار قاتلانہ اقدام کیا تھا۔ ان کے دشمنانہ جرائم اتنے زیادہ تھے جس کی سزا معروف رواج کے مطابق یہی ہو سکتی تھی کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے۔

ان کے ماضی کے جرائم کو معاف کیا جا سکتا تھا۔ مگر یہاں ایک اور خطرہ تھا جو اس سے بہت زیادہ بڑا تھا۔ وہ یہ تھا کہ یہ لوگ اگر چھوڑ دیئے جائیں تو شدید ترین اندیشہ تھا کہ وہ دوبارہ منظم ہو کر اسلام کے خلاف سازشیں کریں گے اور مخالفین اسلام کو منظم کر کے دوبارہ اسلام کے خلاف جنگ چھیڑ دیں گے۔

یہ لوگ بیت اللہ میں لائے گئے۔ وہ لوگ وہاں اس طرح کھڑے تھے گویا کہ وہ اپنی موت کے کنارے کھڑے ہوئے ہیں۔ مگر محمد ﷺ نے ان کے لئے سزا کے بجائے معافی کا اعلان کیا۔ آپ نے فرمایا: ”جاؤ تم سب آزاد ہو“ مگر جب آپ نے یہ رسک لیا تو جتنا بڑا رسک تھا اتنا ہی بڑا اس کا فائدہ بھی بر آمد ہوا۔ یہ فطرت پر اعتماد کا معاملہ تھا۔ تاہم وہ ایک شدید ترین رسک بھی تھا۔

اس واقعہ کے بارے میں راوی کہتے ہیں کہ اس غیر معمولی معافی کے بعد جب وہ لوگ بیت اللہ سے نکلے تو ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ قبروں سے نکلے ہوں، اور پھر وہ اسلام میں داخل ہو گئے (فخرجوا كانما نشروا من القبور فدخلوا فى الاسلام) حياة الصحابة ١/١٧٥)

فتح مکہ کے بعد جب یہ لوگ محمد ﷺ کے پاس آئے تو ان کی نفسیاتی حالت یہ تھی کہ وہ اپنی موت کو یقینی سمجھتے تھے۔ وہ اپنے کو اصحاب قبور میں شمار کر رہے تھے۔ ایسی حالت

میں جب آپ نے ان کو معاف کر دیا تو یہ ایسا ہی تھا جیسے کسی مردہ کو دوبارہ زندگی دے دی جائے۔ محمد ﷺ نے انھیں معاف کر کے انھیں نئی زندگی دے دی تھی۔ یہ ان کے ساتھ اتنا بڑا احسان تھا کہ اس کے بعد وہ سرکشی کا تحمل نہیں کر سکتے تھے۔ نفسیاتی طور پر ان کے بس میں نہ تھا کہ اس اعلیٰ سلوک کے بعد بھی وہ بدستور سرکش بنے رہیں۔ انھوں نے محمد ﷺ کے دین کو قبول کر لیا۔ وہی لوگ جو اب تک آپ کے سب سے بڑے دشمن بنے ہوئے تھے اب وہ آپ کے سب سے بڑے دوست اور ساتھی بن گئے۔ بلاشبہ یہ انسانی تاریخ کا سب سے انوکھا واقعہ تھا، مگر وہ صرف اس وقت پیش آسکا جب کہ آپ نے تاریخ کا سب سے انوکھا رسک لیا۔

دوسرا واقعہ جو میں یہاں پیش کرنا چاہتا ہوں وہ قبیلہ ہوازن کا ہے جو فتح مکہ کے بعد پیش آیا۔ محمد ﷺ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ سے طائف کے لئے روانہ ہوئے۔ راستہ میں قبیلہ ہوازن کی آبادیاں پڑتی تھیں۔ آپ نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا اور نہ ان کے خلاف کوئی بات کہی۔

آپ کا راستہ ایک ایسے مقام سے گذرتا تھا جہاں دو طرف پہاڑیاں تھیں اور درمیان میں ایک وادی تھی جس سے لوگ آتے جاتے تھے۔ جب آپ اور آپ کے ساتھی اس درمیانی راستے میں پہنچے تو ہوازن کے لوگوں نے دونوں طرف کی پہاڑیوں سے زبردست تیر اندازی شروع کر دی۔ اس اچانک حملہ سے مسلمانوں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں، تاہم ابتدائی شکست کے بعد دوبارہ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور ہواز ن کے چھ ہزار افراد گرفتار کر لئے گئے۔

یہ گرفتار شدگان مروجہ طریقہ کے مطابق سخت ترین سزا کے مستحق تھے، مزید اس

بات کا شدید اندیشہ تھا کہ اگر انھیں چھوڑ دیا جائے تو وہ دوبارہ اسلام اور مسلمانوں کے لئے خطرہ بنیں گے۔ اس اعتبار سے ان کی رہائی کا فیصلہ کرنا بلاشبہ بہت بڑا رسک لینا تھا۔ مگر محمد ﷺ نے یہ رسک لیا اور تمام بے کے تمام گرفتار شدگان کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا۔ یہاں تک کہ انھیں سواری اور زادراہ بھی دیا کہ وہ اطمینان کے ساتھ اپنے گھروں کو جا سکیں۔

مگر دوبارہ یہی ہوا کہ وہ سب کے سب اسلام کے دائرہ میں داخل ہو گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ان کے ساتھ جو غیر معمولی سلوک کیا تھا۔ اس کے بعد وہ سرکشی کا تحمل نہیں کر سکتے تھے۔ اس کے بعد اگر وہ سرکشی کرتے تو ان کے اعصاب کی رگیں پھٹ جاتیں، ان کے لئے زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ اس کے بعد تو وہ یہی کر سکتے تھے اور انھوں نے یہی کیا کہ محمد ﷺ کے دین کو اختیار کر لیا۔ وہ آپ کے لئے دشمن انسان کے بجائے دوست انسان بن گئے۔

حقیقت یہ ہے کہ اگر پیغمبر اسلام کو تاریخ سے حذف کر دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسی مثالیں بھی حذف ہو جائیں گی جو کسی ملک کے صرف ظاہری سیاسی ڈھانچہ کو نہیں بدلتیں، بلکہ خود انسان کو اندر تک بدل دیتی ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سنت کا ایک اہم جزٔ فطرت انسانی پر اعتماد ہے۔ آپ کی پوری زندگی میں اس اصول پر عمل کرنے کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔

انسان پتھر کی اسٹیچو کے مانند نہیں ہے بلکہ وہ اپنے سینہ میں فطرت کا ایک خزانہ لئے ہوئے ہے۔ یہ فطرت کسی انسانی شخصیت کا اہم ترین حصہ ہے، اس حقیقت کو قرآن میں ان الفاظ میں بتایا گیا ہے:

ونفس وما سوّاها فالهمها فجورها وتقواها. (الشمس ۷:۸)

(قسم ہے) انسان کی جیسا کہ اس کو درست بنایا۔ پھر اس کو سمجھ دی، اس کی بدی کی اور اس کی نیکی کی۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر آدمی پیدائشی طور پر یہ جانتا ہے کہ برا کیا ہے اور بھلا کیا، صحیح کیا ہے، اور غلط کیا۔ اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ ایک داعی کسی انسان کے سامنے جو دعوت پیش کرنے جارہا ہے اس کا غیر شعوری علم یا اس کی مجہول معرفت انسان کو پیشگی طور پر حاصل ہے، داعی جب کسی انسان کو حق کی دعوت دیتا ہے تو گویا کہ وہ مدعو کی جانی ہوئی بات ہی کو اسے بتارہا ہے۔ وہ مدعو کے لاشعور کو شعور میں لانا چاہتا ہے۔

یہ واقعہ داعی کے اندر یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ میں جو پیغام مدعو کو دینے جارہا ہوں اس پیغام کا ایک مثنّیٰ پہلے ہی سے مدعو کے اندر موجود ہے۔ مدعو خود اپنی اندرونی فطرت کی بنا پر مجبور ہے کہ وہ حق کا اعتراف کرے۔ یہ واقعہ داعی کو ہمیشہ مایوسی سے بچاتا ہے۔ وہ مدعو کی ظاہری بے توجہی یا اس کی مخالفت کو نظرانداز کر کے اس کے سامنے اپنی دعوت پیش کرتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ ایک نہ ایک دن مدعو ضرور اس کے پیغام پر لبیک کہے گا۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی دعوتی زندگی یقین کی ان مثالوں سے بھری ہوئی ہے۔ لوگوں کی ظاہری مخالفت کے باوجود ان کے بارے میں آپ کا یہ یقین کبھی متزلزل نہیں ہوا کہ آخر کار ان کا سینہ کھلے گا اور وہ آپ کے پیغام کو قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے۔

یہی وجہ ہے کہ بدترین مخالفتوں کے باوجود آپ نے ان لوگوں کے خلاف بددعا نہیں کی جو بظاہر آپ کے دشمن بنے ہوئے تھے۔ بلکہ ہمیشہ ان کے حق میں ہدایت کی دعائیں کیں۔ مثلاً طفیل بن عمرو الدوسی مکہ آئے اور انھوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام

قبول کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے قبیلہ دوس کی بستیوں میں گئے اور انھیں توحید کی دعوت دی مگر ان لوگوں نے ان کی بات نہیں مانی حتی کے ان کے خلاف ظالمانہ سلوک کیا۔ وہ دوبارہ رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہا کہ اے خدا کے رسولؐ قبیلہ دوس سرکش ہو گیا ہے اس کے خلاف بد دعا کیجئے۔ مگر رسول اللہ ﷺ نے نہ قبیلہ دوس کو برا بھلا کہا اور نہ ان کے خلاف بد دعا کی۔ اس کے بر عکس آپ نے یہ کیا کہ دعا کے لئے اپنے ہاتھ اٹھائے اور یہ فرمایا: اے اللہ دوس کے لوگوں کو ہدایت دے (اللهم اهد دوساً) سيرة ابن هشام ١/٤٠٩

دعا کے بعد آپ نے طفیل بن عمرو الدوسی سے فرمایا کہ تم اپنے قبیلہ کی طرف واپس جاؤ اور ان کی سختی کے باوجود ان کے ساتھ نرم گفتگو کرو، ان کی زیادتی کے باوجود ان کے ساتھ خیر خواہی کا معاملہ کرو۔ اس نصیحت کا راز یہی تھا کہ آپ یہ یقین رکھتے تھے کہ قبیلہ دوس کے لوگوں کا کیس کوئی مستثنیٰ کیس نہیں ہے، وہ بھی دوسرے انسانوں کی طرح انسان ہیں۔ خدا کی دی ہوئی فطرت ان کے اندر بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح وہ دوسروں کے اندر موجود ہے۔ فطرت پر آپ کا یہ یقین آخری حد تک درست تھا چنانچہ طفیل بن عمرو الدوسی جب واپس گئے اور اپنے قبیلہ کو دوبارہ توحید کی طرف بلایا تو اس کا یہ معجزانہ نتیجہ بر آمد ہوا کہ دھیرے دھیرے قبیلہ کے تمام مرد و عورت دین توحید میں داخل ہو گئے۔

فطرت پر اعتماد پیغمبر اسلام کی ایک عظیم سنت ہے اور اس کی مثالیں آپ کی زندگی کے ہر دور میں اور ہر مرحلے میں پائی جاتی ہیں۔

مدنی دور میں جب اسلام کی آواز سارے عرب میں پھیل گئی اور قبائل کے وفود آکر اسلام قبول کرنے لگے، اس دور کے واقعات میں سے ایک واقعہ وہ ہے جو طائف کے قبیلۂ

ثقیف سے تعلق رکھتا ہے۔

طائف کے قبیلۂ ثقیف کا وفد نویں ہجری میں مدینہ آیا۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کو اسلام کی تعلیمات بتائیں۔ وہ اسلام قبول کرنے پر راضی ہوئے مگر انھوں نے اپنی طرف سے بہت سی شرطیں عائد کیں۔ مثلاً انھوں نے کہا کہ ہم نماز پڑھیں گے اگر چہ وہ ایک دنائت کا فعل ہے۔ مگر نہ صدقہ دیں گے اور نہ جہاد کریں گے۔ اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے ان سے بیعت لے کر ان کو اسلام میں داخل کر لیا۔

کچھ لوگوں نے اس پر اعتراض کیا تو ان کا جواب دیتے ہوئے آپ نے فرمایا یہ لوگ جب اسلام قبول کرلیں گے تو اس کے بعد وہ صدقہ بھی دیں گے اور جہاد بھی کریں گے (سیتصدقون ویجاهدون اذا اسلموا) سیرة ابن کثیر ٥٦/٤

پیغمبر اسلام ﷺ اگر اہل ثقیف کے صرف موجودہ قول کو دیکھتے تو آپ کبھی اس طرح ان کو اسلام میں داخل نہ کرتے مگر آپ نے انسانی فطرت پر اعتماد کیا اور ان کو ان کے حال کے اعتبار سے دیکھنے کے بجائے ان کو ان کے مستقبل کے اعتبار سے دیکھا۔ آپ کا یہ اندازہ مکمل طور پر درست ثابت ہوا۔ چنانچہ قبیلہ ثقیف کے لوگ جلد ہی بعد پورے طور پر اسلام کے عامل بن گئے۔ انھوں نے اسلام کی تمام تعلیمات پر عمل کیا اور اس کو اپنی سعادت سمجھا۔

آپ کی اسی پالیسی کا نتیجہ تھا کہ آپ کو لوگوں کے خلاف تشدد کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آپ نے دشمن کے ساتھ بھی ایسا معاملہ کیا جیسے کہ وہ آپ کا دوست ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں پہلی بار آپ نے یہ کامیابی حاصل کی کہ ایک پوری قوم میں ایسا انقلاب لائیں جس کو بلاشبہ غیر خونی انقلاب کہا جاسکتا ہے۔

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے تمام انسانوں کو ایک فطرت پر پیدا کیا ہے، اور یہ تخلیقی فطرت کبھی بدلنے والی نہیں (روم ۳۰) یہی بات حدیث رسول میں اس طرح آئی ہے کہ ہر پیدا ہونے والا فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے (کل مولود یولد علی الفطرة) تفسیر ابن کثیر ۳/ ۴۳۲

ایک اور حدیث میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنے بندوں کو سیدھے طریقے پر پیدا کیا ہے (انی خلقت عبادی حنفاء) اس سے معلوم ہوا کہ تمام انسان پیدائشی طور پر ایک ہیں۔ کوئی بھی انسان ایسا نہیں کہ حق کی دشمنی اس کی فطرت کا اس طرح جزء ہو کہ دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہ کیا جاسکے۔

داعیانہ نقطۂ نظر سے، یہ ایک بے حد اہم حقیقت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ داعی اگر دیکھے کہ انسانی گروہ میں کچھ لوگ اس کے موافق اور کچھ لوگ اس کے مخالف ہیں تو داعی کو چاہئے کہ وہ اس فرق کو حقیقی نہ سمجھے۔ فطرت پر اعتماد کرتے ہوئے اس کا ذہن یہ ہونا چاہئے کہ موافق انسان اگر بالفعل طور پر اس کا ساتھی ہے تو مخالف انسان بالقوۃ طور پر اس کا ساتھی۔ یہ ذہن داعی کو ابدی طور پر ایک پر امید انسان بنا دیتا ہے۔ مخالف انسان کے لئے بھی اس کے دل میں وہی خیر خواہی ہوتی ہے جو دوست انسان کے لئے اس کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ بظاہر دشمن کو بھی یکساں طور پر اعتدال کی نفسیات کے تحت اپنا مخاطب بناتا ہے یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے جبکہ اس کا دشمن بھی اس کا دوست بن جائے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

ولاتستوی الحسنة ولا السئیة ادفع بالتی هی أحسن فاذاالذی بینك وبینه عداوة كانه ولیّ حمیم (حٰم السجده. ٣٤)

اور بھلائی اور برائی دونوں برابر نہیں، تم جواب میں وہ کہو جو اس سے بہتر ہو پھر تم دیکھو گے کہ تم میں اور جس میں دشمنی تھی، وہ ایسا ہو گیا جیسے کوئی دوست قرابت والا۔

دشمن کے دوست بننے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے وہ آگ تھا اب پانی ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ پہلے ہی سے پانی تھا۔ اس کی شخصیت کی سطح پر کچھ چیزیں اوپری طور پر جمع ہو گئی تھیں۔ ان اوپری چیزوں کو داعی نے اپنے خیر خواہانہ سلوک سے ہٹادیا۔ اس کے بعد اس کا حقیقی انسان ابھر آیا اور حقیقی شخصیت کی سطح پر ہر آدمی حق کا دوست ہی ہوتا ہے، وہ اس کا دشمن نہیں ہوتا۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی پوری زندگی میں غیر مسلموں سے کام لیا اور ان سے فائدہ اٹھایا۔ ابو طالب کی وفات کے بعد جب آپ اپنے قبیلہ کی حمایت سے محروم ہو گئے تو آپ نے دوسرے قبائل کے پاس جاکر ان سے اپنے لئے حمایت چاہی حالانکہ اس وقت یہ قبائل مشرک تھے۔ طائف سے واپسی کے بعد آپ مکہ کے ایک مشرک سردار مطعم بن عدی کی حمایت میں دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے۔ ہجرت کے سفر میں آپ نے مشرک عبداللہ بن ارقط کو اپنا گائیڈ بنایا۔ اس طرح کے مختلف واقعات ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بار بار غیر مسلموں پر بھروسہ کیا اور اپنے مقصد کے لئے ان کو استعمال فرمایا۔

انسانوں کو دوست اور دشمن کی تقسیم میں بانٹنا سنت رسول کے خلاف ہے اور اسی کے ساتھ وہ فطرت انسانی کے خلاف بھی۔

سیرت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ فطرت پر اعتماد اسلام کا ایک مستقل اصول ہے۔ اسلام کے مطابق، لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ یا ان کی کارروائیاں زیادہ قابل لحاظ نہیں۔ کیوں کہ یہ سب وقتی چیزیں ہیں۔ لوگوں سے معاملہ کرتے ہوئے اصل قابل

لحاظ چیز انسانی فطرت ہے۔ انسان بنیادی طور پر جس چیز کے تابع ہے وہ اس کی پیدائشی فطرت ہے۔ اس کے سوا جو چیزیں ہیں وہ سب وقتی اور عارضی ہیں، وہ انسانی سلوک کے معاملہ میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت نہیں رکھتیں۔

رسول اللہ ﷺ کی یہ سنت بتاتی ہے کہ خواہ انفرادی معاملہ ہو یا اجتماعی معاملہ، ہمیشہ یہ کرنا چاہیئے کہ ظاہری چیزوں کو نظر انداز کیا جائے۔ سب سے زیادہ اہمیت اس بات کو دی جائے کہ فطرت انسانی کا تقاضا کیا ہے۔ فطرت کی رعایت ہر قسم کی کامیابی کی یقینی ضمانت ہے۔

ایک شخص یا ایک گروہ اگر کسی بات پر مشتعل ہو جائے تو ایسے موقع پر اصل قابلِ لحاظ چیز اس کا اشتعال نہیں ہے۔ بلکہ اصل قابل لحاظ چیز یہ ہے کہ ظاہری اشتعال کے باوجود اس کی فطرت بدستور اپنے تخلیقی نقشہ پر قائم رہے۔ ایسی حالت میں اگر اشتعال کو نظر انداز کر کے فطرت کی رعایت کی جائے تو اپنے آپ مسئلہ ختم ہو جائیگا۔ اشتعال اچانک جاتا رہے گا اور اس کے بعد جو چیز بچے گی وہ عین وہی ہو گی جو ہمارا مطلوب ہے۔ یعنی انسانیت جس پر خدا نے فطرت کو قائم کیا ہے۔

اظہار رسالت

دور جدید کو اسلام کے لئے مسائل کا دور سمجھا جاتا ہے۔ مگر یہ برعکس بات ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ دور جدید دراصل دور اسلام تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے کہ بارش کا زمانہ زراعت کا زمانہ ہوتا ہے۔ مگر مسلمان اپنی عدم معرفت کی بنا پر اس کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ اس لئے وہ جدید امکان کو اپنے حق میں استعمال بھی نہ کر سکے۔

وہ چیز جس کو قرآن میں اظہار دین کہا گیا ہے وہ کوئی وقتی واقعہ نہ تھا بلکہ وہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اسلام کے ابدی غلبہ کا اعلان تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ افکار و نظریات کی دنیا میں ایسا انقلاب پیدا کیا جائے گا جو نظری حیثیت سے ہمیشہ کے لئے اسلام کو ظاہر و غالب کر دے۔ یہ امکان خدا کی طرف سے کھولا جاتا ہے مگر اس کو استعمال کر کے واقعہ کی صورت میں ڈھالنا یہ خود اہل اسلام کا کام ہے۔

پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے ذریعہ ساتویں صدی میں جو انقلاب لایا گیا اس کا مقصد قرآن میں اظہار دین بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے:

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منھ سے بجھا دیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کئے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ منکروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے خواہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو (التوبہ ۳۳۔۳۲)

اظہار کے معنی عربی زبان میں غلبہ کے ہیں۔ یہاں اظہار دین سے مراد سیاسی غلبہ نہیں ہے بلکہ فکری غلبہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ فکری اور نظریاتی اعتبار سے خدا کا دین

برتر حیثیت حاصل کر لے، نظریاتی صداقت کسی اور دین کے حق میں باقی نہ رہے۔

خدا کے دین کو فکری غلبہ کا مقام عطا کرنا کوئی سادہ بات نہیں۔ یہ دراصل ایک نئی تاریخ کو ظہور میں لانے کے ہم معنی ہے۔ باعتبار واقعہ خدا کے دین کو برتر حیثیت ہی حاصل ہے مگر قدیم زمانے میں انسانی علوم وافکار کا ارتقا توہماتی خطوط پر ہوا۔ اس نے دین حق کی اس فطری حیثیت پر پردہ ڈال دیا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ ہوئی کہ پیغمبر آخر الزماں کے ذریعہ ایک ایسا فکری انقلاب لایا جائے جو اس مصنوعی ناموافق صورت حال کو بدل دے۔ جس کے بعد خود علوم انسانی دین حق کی تصدیق کرنے والے بن جائیں۔ انسان کے خود اپنے مسلمہ علمی معیار کے مطابق دین توحید کو لوگوں کے لئے ثابت شدہ بنایا جاسکے۔

اس آیت میں اظہار دین سے مراد یہی ربانی منصوبہ ہے، پیغمبر اور آپ کے اصحاب کے ذریعہ خدا کی تائید سے جو انقلاب آیا اس کے بعد تاریخ انسانی میں ایک نیا عمل (process) شروع ہوا۔ اس عمل کا مقصد یہ تھا کہ توہماتی پردے چاک ہو جائیں اور فطرت میں چھپی ہوئی وہ علمی شہادتیں سامنے آجائیں جن کے ذریعہ دین توحید کی صداقت کو نمایاں کرنا ممکن ہو سکے۔ موجودہ زمانہ میں یہ انقلاب اپنی آخری تکمیل تک پہنچ چکا ہے۔

اس اظہار دین کا مقصد خاص طور پر دو تھا۔ ایک طرف یہ کہ مذہبی جبر کا نظام ختم ہو جائے تاکہ دینی دعوت کا وہ کام آسان ماحول میں انجام پانے لگے جو پچھلے زمانوں میں صرف مشکل حالات میں انجام دیا جاسکتا تھا۔ دوسرا مقصد یہ کہ دلائل کی تمام طاقت صرف خدا کے دین کے حق میں اکٹھا ہو جائے۔ بقیہ تمام ادیان دلائل کی طاقت سے کامل طور پر محروم ہو جائیں۔ یہ دونوں کام موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر انجام پاچکے ہیں۔ ذیل

میں مختصراً اس کا ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں بادشاہت کا نظام تھا۔ بادشاہت جیسا شخصی نظام صرف جبر کی طاقت سے قائم ہو سکتا تھا۔ اسی لئے تمام بادشاہوں نے ہر جگہ جبر کا نظام قائم کر رکھا تھا۔ وہ فکری یا مذہبی آزادی کو ہمیشہ کچل دیتے تھے۔ یہ حالت دینی دعوت کے لئے نیز انسانی فکر کے عمومی ارتقاء کے لئے ایک مستقل رکاوٹ تھی۔ پیغمبر اور اصحاب پیغمبر کے ذریعہ جو انقلاب لایا گیا اس نے اپنے وقت کے جابرانہ سیاسی نظام کو توڑ کر تاریخ میں آزادی اور جمہوریت کے دور کا آغاز کیا۔ اس انقلاب کے اثرات پراسس کے روپ میں تاریخ انسانی میں شامل ہو گئے۔ یہ عمل جاری رہا یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں وہ اپنی تکمیل تک پہنچ گیا۔ اب یہ ممکن ہو گیا کہ دعوت حق کے کام کو آزادی کے ماحول میں انجام دیا جا سکے۔ جس کو پہلے صرف جبر کے حالات میں انجام دینا ممکن ہوتا تھا۔

۲۔ شرک توہماتی مذہب کا دوسرا نام ہے۔ قدیم زمانہ میں یہی شرک عالمی ذہن پر چھایا ہوا تھا۔ لوگ مکمل طور پر توہماتی افکار سے مغلوب تھے۔ سائنس کی ترقی ناممکن ہو گئی تھی۔ پیغمبر اور اصحاب پیغمبر نے توہماتی نظام کو ختم کر دیا۔ اس طرح انہوں نے علمی طرز فکر کا دروازہ کھولا اور سائنس کے دور کا آغاز کیا۔ یہ تبدیلی ایک پراسس کی صورت میں تاریخ میں جاری رہی۔ یہاں تک کہ موجودہ زمانہ میں وہ اپنی تکمیل تک پہنچ گئی۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب نے اسلامی دعوت کے حق میں نئے عظیم امکانات کھول دئے ہیں۔

۳۔ سائنسی انقلاب جو دراصل اسلامی انقلاب ہی کی ایک ضمنی پیداوار (by-product) تھا، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چیز وجود میں آئی جس کو جدید کمیونی کیشن کہا جاتا ہے۔ اس نئے

دور کے ظہور نے تاریخ میں پہلی بار اس کو ممکن بنادیا کہ اسلام کی اشاعت کا کام عالمی سطح پر انجام دیا جاسکے۔ حدیث میں آیا ہے کہ ایک زمانہ آئے گا جب کہ اللہ کا کلمہ دنیا کے تمام گھروں میں داخل ہو جائے گا۔ (مسند احمد) یہ بالواسطہ انداز میں اسی جدید کمیونی کیشن کے دور کی پیشین گوئی ہے۔ کیوں کہ ان ذرائع کے حصول کے بغیر اسلام کی عالمی اشاعت سرے سے ممکن ہی نہ ہوتی۔

۴۔ جدید سائنسی انقلاب ہی کا ایک نتیجہ یہ ہے کہ نئے نئے دلائل اسلامی عقائد کی تائید میں حاصل ہو گئے۔ پہلے اسلام کے داعی اسلام پر صرف روایتی دلائل قائم کر سکتے تھے۔ موجودہ زمانہ میں یہ ممکن ہو گیا کہ اسلامی حقیقتوں کو خود علم انسانی کے مسلمہ معیار پر ثابت شدہ بنایا جاسکے۔

۵۔ قدیم زمانہ میں مذہب کا مطالعہ مقدس انداز میں صرف اعتقادی طور پر کیا جاسکتا تھا۔ اس لئے معتبر اور غیر معتبر مذہب کا فرق علمی طور پر الگ الگ نہیں ہوا تھا۔ موجودہ زمانہ میں سائنسی انقلاب کے اثر سے مذاہب کا مطالعہ اسی طرح بے لاگ تنقیدی انداز میں کیا جانے لگا جس طرح دوسری تمام چیزوں کا تنقیدی انداز سے جائزہ لیا جاتا ہے۔ اس تنقیدی جائزہ نے خالص علمی سطح پر یہ ثابت کردیا کہ تاریخی طور پر صرف اسلام ہی ایک معتبر مذہب ہے۔ دوسرے تمام مذاہب تاریخی اعتباریت (historical credibility) سے محروم ہیں۔ اس فکری انقلاب کے بعد یہ ممکن ہو گیا کہ اسلام کی صداقت کو خالص علم انسانی کے معیار پر ثابت شدہ بنایا جاسکے۔ دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں اس کے واحد صداقت ہونے کو مدلل کیا جاسکے۔

ان جدید انقلابات نے موجودہ زمانہ میں اسلام کو بلا مقابلہ فتح (unopposed victory)

کے مقام تک پہنچادیا ہے۔اب ضرورت صرف یہ ہے کہ مسلمان مدعو قوم کے خلاف تشدد اور نفرت کی ہر کارروائی کو یک طرفہ طور پر ختم کردیں تاکہ داعی اور مدعو کے درمیان معتدل تعلقات قائم ہوں اور نارمل حالات میں لوگوں کو اسلام کا مخاطب بنایا جاسکے۔اس نئی صورت حال کے بعد یہ ممکن ہو گیا ہے کہ اسلام اور غیر اسلام کے درمیان سنجیدہ اور مفید ڈائیلاگ شروع کیا جاسکے جس کا نتیجہ لازمی طور پر صرف اسلام کے حق میں ظاہر ہو گا۔

ایک عظیم امکان

ا۔دین کے غیبی عقائد پر چونکہ براہ راست استدلال قائم نہیں کیا جاسکتا،وہ صرف بالواسطہ استدلال یا استنباطی استدلال کے ذریعہ ثابت کئے جاسکتے ہیں۔اس سے اہل علم یہ سمجھنے لگے تھے کہ دینی حقائق صرف اعتقاد سے تعلق رکھتے ہیں وہ علمی حقیقتیں نہیں۔مگر موجودہ زمانہ میں ایٹم کے ٹوٹنے کے بعد علم منطق میں جو تبدیلی آئی اس کے بعد مان لیا گیا کہ استنباطی استدلال بھی،اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا ہی معقول اور معتبر (valid) ہے جتنا کہ براہ راست استدلال۔اس کے بعد دینی حقیقتوں کو اسی علمی سطح پر ثابت کرنا ممکن ہو گیا جس سطح پر غیر مذہبی یا مادی نظریات ثابت کئے جاتے ہیں۔

۲۔قدیم زمانہ میں انسان جب دنیا پر نظر ڈالتا تھا تو اس کو بظاہر دکھائی دیتا تھا کہ یہاں طرح طرح کی اشیاء ایک دوسرے سے بالکل مختلف نوعیت کی پائی جاتی ہیں۔یہ مشاہدہ اپنے ظاہر کے اعتبار سے شرک کا ذہن پیدا کرتا تھا۔لوگ سوچنے لگے کہ جب اشیاء متعدد ہیں تو ان کا خالق بھی متعدد ہو گا۔مگر سائنسی مطالعہ سے ثابت ہوا کہ یہ فرق اور تنوع صرف ظاہری ہے۔ورنہ تمام اشیاء ایک ہی مادہ کا مختلف ظہور ہیں۔اس طرح شرک کے حق میں

فکری بنیاد ختم ہو گئی اور توحید کے حق میں فکری بنیاد قائم ہو گئی۔

۳۔ قرآن کے بیان کے مطابق، یہاں آفاق و انفس میں خدا کی نشانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ سائنس کے مطالعہ نے ان کو ظاہر اور معلوم بنادیا (حٰم السجدہ ۵۳) یہاں تک کہ کائنات دلائل ربانی کی ایک عظیم کتاب بن گئی۔

۴۔ سائنس کی نئی دریافتوں کے بعد بہت سی ایسی چیزیں انسان کے علم میں آئی ہیں جنھوں نے دینی اہمیت رکھنے والے واقعات کو نئے دلائل سے ثابت کرنا ممکن بنادیا ہے۔ مثلاً کاربن ۱۴ اڈیٹنگ نے اس بات کو ممکن بنادیا کہ ریمسس دوم (فرعون موسیٰ) کی ممی کی ہوئی لاش کی عمر ٹھیک معلوم کی جائے اور اس طرح قرآن کے اس بیان کی سائنسی تصدیق فراہم ہو سکے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ نے فرعون کے جسم کو محفوظ رکھا تھا تا کہ وہ بعد کے انسانوں کے لئے نشانی بن سکے (یونس ۹۲)

اسلام اور دور حاضر

اسلام پورے معنوں میں ایک پرامن مذہب ہے۔ ایسی حالت میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک ایسا اسلام جو امن کی تعلیم دیتا ہو، کیا وہ دور حاضر کے لئے ریلونٹ (relevant) ہے۔ کیا وہ نئے حالات میں اپنے لئے دوبارہ برتر حیثیت حاصل کر سکتا ہے۔

اس کا جواب مکمل طور پر اثبات میں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کا ایک پرامن مذہب ہونا بتاتا ہے کہ وہ ایک ابدی مذہب ہے، اگر وہ وائلنس کا مذہب ہوتا تو وہ ابدی نہ ہوتا۔ کیوں کہ موجودہ زمانہ میں فکر جدید کے نزدیک وائلنس کا طریقہ مکمل طور پر رد ہو چکا ہے۔ اب انسانی ذہن صرف کسی ایسے ہی سسٹم کو قابل غور یا قابل قبول سمجھ سکتا ہے جس کی تعلیمات امن اور نان وائلنس پر مبنی ہوں۔

جدید ذہن نے کمیونزم کو رد کر دیا۔ اس کی کم از کم ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ کمیونزم تشدد میں یقین رکھتا ہے۔ اور تشدد جدید ذہن کے لئے کسی بھی حال میں قابل قبول نہیں۔ اس طرح دوسرے تشدد پسند نظریات مثلاً نازی ازم اور فاشزم بھی اسی بنیاد پر رد کئے جا چکے ہیں۔ جدید انسان مذہبی یا غیر مذہبی انتہا پسندی (extremism) کو اس لئے ناپسند کرتا ہے کہ وہ انسان کو آخر کار تشدد کی طرف لے جاتی ہیں۔

مگر اسلام ایک فطری مذہب ہے۔ اس میں اول دن ہی سے تشدد اور وائلنس کو غیر مطلوب قرار دیا گیا ہے۔ اسلام اول دن ہی سے امن کا علم بردار رہا ہے نہ کہ تشدد کا۔ ماضی میں اسلام نے انسانی تعمیر کے لئے ایک عظیم رول ادا کیا جس کے نتیجہ میں انسانی تاریخ نئے ترقیاتی دور میں داخل ہوئی۔ آج وقت آگیا ہے کہ اسلام ایک بار پھر اپنا تعمیری رول ادا کرے اور انسانی تاریخ کو دوبارہ ترقی کے نئے دور میں داخل کرے۔

وہ چیز جس کو سائنسی یا ٹکنکل ترقی کہا جاتا ہے۔ وہ نیچر کی دریافت کا نتیجہ ہے۔ یہ نیچر ہمیشہ سے ہماری دنیا میں موجود تھی، پھر اس کی دریافت میں اتنی دیر کیوں لگی، جو سائنسی ترقی پچھلے چند سو سال سے نظر آئی ہے وہ ہزاروں سال پہلے کیوں ظہور میں نہ آسکی۔

اس کا سبب یہ تھا کہ قدیم زمانہ میں مذہب اور سائنس (علم الٰہی اور علم انسانی) ایک دوسرے سے جڑے ہوئے تھے۔ اس طرح مذہبی دار وگیر سائنس کی ترقی میں ایک مستقل رکاوٹ تھی۔ اسلام نے یہ کیا کہ مذہب کو (جو عملاً توہماتی عقائد کا مجموعہ بن گیا تھا) سائنسی تحقیق کے عمل سے جدا کر دیا۔ مثلاً چاند گرہن اور سورج گرہن کو انسانی تقدیر کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ پیغمبر اسلام نے اعلان کیا کہ گرہن کا انسانی تقدیر سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ تمام تر فلکیاتی واقعات ہیں نہ کہ تقدیری واقعات (فتح الباری ۲/۶۱۱)

کھجوروں کی پالی نیشن (تابیر نخل) کے مشہور واقعہ میں پیغمبر اسلام نے اعلان فرمایا کہ اس طرح کے معاملات میں تم اپنے تجربہ کے مطابق عمل کرو۔ کیوں کہ ان امور کو تم زیادہ جانتے ہو (صحیح مسلم بشرح النووی ۱۵/۱۱۷)

یہ مذہب اور سائنس کو ایک دوسرے سے جدا (delink) کر دینا تھا۔ اس طرح سائنسی تحقیق کو اپنے عمل کے لئے آزادی کا ماحول مل گیا۔ اس کے بعد تاریخ میں پہلی بار ایسا ہوا کہ سائنسی علم مذہب کی مداخلت کے بغیر آزادانہ طور پر ترقی کرنے لگا۔ اور تدریجی طور پر آگے بڑھتے ہوئے موجودہ حالت تک پہنچ گیا۔

آج انسان دوبارہ ایک اور شدید تر مسئلہ سے دوچار ہے۔ وہ یہ کہ سائنس اور ٹکنالوجی میں غیر معمولی ترقی کے باوجود انسانی زندگی طرح طرح کے مسائل میں مبتلا ہے، اور اس سے چھٹکارے کا کوئی راستہ اس کو نظر نہیں آتا۔

یہ جدید مسئلہ ایک لفظ میں، آزادی کی حد کو نہ جاننے کا مسئلہ ہے۔ جدید انسان نے آزادی کو ایک خیر اعلیٰ کی حیثیت سے دریافت کیا، مگر وہ آزادی کی حد کو دریافت نہ کر سکا۔ چنانچہ آزادی اس کے یہاں لامحدود آزادی کی صورت اختیار کر کے انارکی اور بے قیدی کے ہم معنی بن گئی۔ موجودہ زمانہ میں مغربی سماج میں پیدا ہونے والے تمام مسائل کا اصل سبب یہی ہے۔ اب انسان کو ایک ایسی آئیڈیالوجی کی ضرورت ہے جو انسانی آزادی کی حد کو بتائے، جو مطلوب آزادی اور غیر مطلوب آزادی کے درمیان خط کھینچ سکے۔ اس قسم کی آئیڈیالوجی صرف اسلام فراہم کر سکتا ہے۔

آج بہترین وقت آگیا ہے کہ انسان کو اسلام کی یہ آئیڈیالوجی پیش کی جائے اور وہ اس کو دل کی آمادگی کے ساتھ قبول کر لے۔

کمیونزم کے سقوط (۱۹۹۱) کے بعد ساری دنیا میں ایک نظریاتی خلا (idealogical vacuum) پیدا ہو گیا ہے۔ یہ خلا صرف اسلام پر کر سکتا ہے۔ موجودہ دنیا میں ایسے ملک ہیں جو اقتصادی سپر پاور یا فوجی سپر پاور کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ مگر آئیڈیالوجیکل سپر پاور کی جگہ خالی ہے اور وہ امکانی طور پر صرف اسلام کا حصہ ہے۔ اسلام کے حق میں اس عظیم امکان کو واقعہ بنانے میں صرف ایک رکاوٹ ہے۔ اور وہ موجودہ زمانہ کی مسلم تحریکوں کا متشددانہ رخ اختیار کر لینا ہے۔ ان تحریکوں نے اسلام کو دنیا کے سامنے ایک تشدد پسند مذہب (وائلنٹ ریلیجن) کے روپ میں پیش کیا۔ اس بنا پر آج کا انسان اسلام سے بدکتا ہے۔ وہ معتدل ذہن کے ساتھ اسلام کا مطالعہ نہیں کرپاتا۔ اگر اس مصنوعی صورت حال کو ختم کر دیا جائے اور اسلام کو دوبارہ ایک نان وائلنٹ مذہب یا پیس فل سسٹم کے انداز میں دنیا کے سامنے لایا جائے تو دوبارہ انسانیت اس کو اپنے دل کی آواز پا کر اسے قبول کر لے گی۔

جدید انسان کو ایک نئے مذہب یا نئے سسٹم کی تلاش ہے۔ ایک ایسا سسٹم جس کی تعلیمات امن پر مبنی ہوں، جو توہماتی عقائد سے خالی ہو، جس میں گہرے نفسیاتی سوالات کے جوابات موجود ہوں، جو سائنسی حقیقتوں سے ٹکراتا نہ ہو، جو اپنے پیچھے ایک کامیاب تاریخ رکھتا ہو۔

اس قسم کا مذہب آج اسلام کے سوا اور کوئی نہیں۔ یہ صرف اور صرف اسلام ہے جو ان تمام شرطوں پر پورا اترتا ہے۔ انفرادی طور پر آج بھی بہت سے ایسے مرد اور عورت ہیں جنہوں نے اسلام کا مطالعہ کرنے کے بعد اسلام کی اس خصوصیت کا اعتراف کیا ہے۔ ان میں سے ایک تعداد وہ ہے جو نظری طور پر اسلام کی اس صفت کا اعتراف کرتی ہے۔ اور ایک تعداد وہ ہے جس نے اس سے آگے بڑھ کر باقاعدہ طور پر اسلام قبول کر لیا۔

دعوہ ایکٹوزم

اسلامک ایکٹوزم اپنے متھڈ کے اعتبار سے نان وائلنس پر مبنی ہے اور اپنے نشانہ کے اعتبار سے دعوت پر۔ دعوت حقیقۃً اسلام کی اشاعت کے لئے پرامن جدوجہد کا نام ہے۔ اس اعتبار سے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اسلامک ایکٹوزم دراصل دعوہ ایکٹوزم ہے۔

دعوت کا کام سادہ کام نہیں۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو کلیدی عمل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کام کو بھرپور طور پر انجام دیا جائے تو بقیہ تمام مطلوبات اپنے آپ حاصل ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں قرآن کے چند حوالے یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

۱۔ دعوت کے ذریعہ اغیار کے شر کے مقابلہ میں خدا سے حفاظت حاصل ہوتی ہے۔ (المائدہ ۶۷)

۲۔ دعوت کے ذریعہ دشمن بھی دوست بن جاتا ہے (حٰم السجدہ ۳۴)

۳۔ دعوت کے ذریعہ اسلام کی نظریاتی برتری ثابت ہوتی ہے۔ اور بلاشبہ نظریاتی برتری سے زیادہ بڑی چیز اور کوئی نہیں۔ (یونس ۳۲)

۴۔ دعوت کے ذریعہ امت کے اندر مثبت مزاج پیدا ہوتا ہے۔ جس کو قرآن میں نصح اور امانت کہا گیا ہے۔ (الاعراف ۶۸)

۵۔ دعوت کا کام انسان کے ذریعہ انجام پاتا ہے مگر اس کے لئے موافق حالات خدائے برتر کی طرف سے مہیا کئے جاتے ہیں۔ جس طرح بارش خدا کی طرف سے ہوتی ہے مگر زراعت کا عمل کسان کو انجام دینا پڑتا ہے۔ اب اہل اسلام کا کام یہ ہے کہ وہ دوسرے بے نتیجہ کاموں میں اپنی طاقت صرف نہ کریں۔ وہ اپنی ساری قوت دعوہ ورک میں لگا دیں۔ تمام بہترین نتائج اسی عمل کے ذریعہ برآمد ہوں گے۔

پیغمبر اسلام اور ان کے ساتھ تقریباً دو سو اصحاب مکہ سے اس حال میں نکلے تھے کہ مکہ کے سرداروں نے ان کا مکہ میں رہنا ناممکن بنا دیا تھا۔ حتی کہ وہ پیغمبر اسلام کے قتل پر آمادہ ہو گئے تھے۔ مگر مکہ سے مدینہ پہنچ کر آپ نے وہاں جو پہلی تقریر کی اس میں نہ کوئی تلخی تھی اور نہ اہل مکہ کے خلاف انتقامی تشدد کی کوئی بات۔ (ملاحظہ ہو سیرۃ ابن ہشام، الجزء الثانی صفحہ ۱۹۔۱۱۸)

آپ نے مدینہ پہنچ کر سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ جو کام کیا وہ یہ تھا کہ اطراف کے تمام قبائل سے امن کا معاہدہ کرنا شروع کیا مثلاً بنو خزاعہ وغیرہ۔ یعنی یہ کہ نہ تم ہمارے خلاف لڑو گے اور نہ ہم تمہارے خلاف لڑیں گے۔ ان امن معاہدات میں عرب کے بیشتر قبائل شامل ہو گئے۔

البتہ قریش مکہ نے جارحیت پر اصرار کیا اور عملی طور پر چند جنگی اقدام بھی کئے۔ مگر آخر کار ہجرت کے چھٹے سال آپ نے حدیبیہ کے مقام پر ان سے بھی امن کا معاہدہ کر لیا۔ اگرچہ یہ معاہدہ قریش کی یک طرفہ شرائط پر کیا گیا تھا۔

اسلام پورے معنی میں ایک امن پسند مذہب ہے۔ اگر دوسرے لوگ تشدد اور بے امنی کی فضا پیدا کریں تو اسلام کا تقاضہ ہے کہ ایسے موقع پر جوابی تشدد نہ کیا جائے بلکہ رد عمل سے بچتے ہوئے ایسی مثبت کارروائی کی جائے کہ اہل اسلام اور غیر اہل اسلام کے درمیان امن قائم ہو سکے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام انسانی سماج میں جن مقاصد کو فروغ دینا چاہتا ہے وہ صرف پر امن ماحول ہی میں بروئے کار لائے جا سکتے ہیں۔ تشدد اور ٹکراؤ کی منفی فضا میں اسلام کا کوئی بھی مقصد حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے ہمیشہ یک طرفہ صبر کے اصول پر عمل کیا۔ جب بھی دوسروں نے نفرت اور تشدد کی آگ بھڑکانا چاہا تو اللہ کے حکم کے مطابق، آپ نے ایسی تدبیریں اختیار کیں کہ نفرت اور تشدد کا ماحول ختم ہو کر اعتدال اور باہمی محبت کا ماحول قائم ہو گیا۔ (المائدہ ۶۴)

پیغمبر اسلام ﷺ کے زمانہ میں دین کا جو اظہار ہوا وہ بعد کے زمانوں میں بھی مطلوب ہے۔ ہر زمانہ کے مسلمانوں پر یہ فرض ہے کہ وہ ہر قسم کی کوشش کر کے اس کو نسل در نسل جاری رکھیں۔ دین اسلام ہمیشہ ظاہر اور برتر دین کی حیثیت سے دنیا میں قائم رہے۔

یہ ایک غیر سیاسی نشانہ ہے اور اس کو غیر سیاسی طریقہ کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے وہی تحریک درست ہے جو اسلام کو خالص فکری اور نظریاتی اعتبار سے لے کر اٹھے اور مکمل طور پر امن کے دائرہ میں اس کی جدوجہد جاری کرے۔

امن کی طاقت

پر امن عمل (نان وائلنٹ ایکٹوزم) کسی محدود عمل کا نام نہیں، بلکہ وہ ایک مکمل عمل کا نام ہے۔ ہر معاملہ میں وہ یکساں طور پر کارگر ہے۔

دو فریق کے درمیان جب کوئی معاملہ پیش آئے، خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی تو ایک صورت وہ ہوتی ہے جس کو ٹکراؤ اور تشدد کا طریقہ کہا جاتا ہے۔ دوسرا طریقہ وہ ہے جس میں ٹکراؤ اور تشدد سے اجتناب کرتے ہوئے پر امن ذرائع سے مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش کی جائے، پر امن ذرائع کی مختلف صورتیں ہیں، یہ دراصل معاملہ کی نوعیت ہے جو یہ بتاتی ہے کہ پر امن ذرائع میں سے کس ذریعہ کو کس موقع پر استعمال کرنا چاہئے۔

اسلام نان وائلنس کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ خدا فساد کو پسند نہیں کرتا (البقرہ ۲۰۵) فساد سے یہاں کیا مراد ہے وہ بھی اسی آیت میں واضح طور پر موجود ہے، اس کے مطابق، فساد اس عمل کا نام ہے جس کے نتیجہ میں سماجی نظام میں خلل واقع ہو۔ اور جان و مال کا نقصان پیش آئے (البقرۃ ۲۰۵)

اس کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو یقیناً وہ یہ ہوگا کہ خدا نان وائلنس (عدم تشدد) کو پسند کرتا ہے، خدا کو یہ پسند نہیں کہ انسانی معاشرہ میں وائلنس (تشدد) کا عمل کیا جائے اور پھر لوگوں کو مال کی تباہی اور جان کی ہلاکت سے دوچار ہونا پڑے۔ اس کی تائید قرآن کے دوسرے بیانات سے بھی ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن میں اللہ کا ایک نام، السلام (peace) بتایا گیا ہے، (الحشر ۲۳) اسی طرح قرآن میں خدا کے مطلوب دین کو سبل السلام (پیس کے راستے) کہا گیا ہے (المائدہ ۱۶) جنت جو کہ خدا کے پسندیدہ معاشرہ کا آخری مقام ہے اس کو

قرآن میں دار السلام (پیس کا گھر) بتایا گیا ہے۔ (الانعام ۱۲۷) وغیرہ۔

قرآن کا پورا مزاج اسی تصور کی حمایت کرتا ہے۔ مثال کے طور پر قرآن میں صبر کو بے حد اہمیت دی گئی ہے۔ حتی کہ صبر واحد اسلامی عمل ہے جس پر استثنائی طور پر بلا حساب اجر کا وعدہ کیا گیا ہے۔ (الزمر ۱۰) صبر دراصل پر امن رد عمل کا نام ہے اور اس کے مقابلہ میں بے صبری متشددانہ رد عمل کا نام، صبر اپنی حقیقت کے اعتبار سے عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں نان وائلنس کہا جاتا ہے۔ صابرانہ عمل کا مطلب نان وائلنٹ عمل ہے۔

حدیث میں یہ بات مزید صراحت کے ساتھ آئی ہے۔ ایک روایت کے مطابق، پیغمبر اسلام نے فرمایا: ان الله يعطى على الرفق مالا يعطى على العنف (سنن ابی داؤد ٤/٢٥٥)

اس حدیث میں عنف کے مقابلہ میں رفق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ عین وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں عنف اور لاعنف کہا جاتا ہے۔ اس حدیث میں واضح طور پر عنف (وائلنس) کے مقابلہ میں لاعنف (نان وائلنس) کی ابدی فوقیت بتائی گئی ہے۔

رفق (non-violence) پر خدا وہ دیتا ہے جو وہ عنف (violence) پر نہیں دیتا۔ یہ کوئی سادہ بات نہیں۔ بلکہ نہایت وسیع اور گہری بات ہے۔ اس میں فطرت کے ایک اٹل قانون کو بتایا گیا ہے۔ خود فطرت کے قانون کے تحت ایسا ہے کہ تمام بری چیزیں وائلنس کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں اور تمام اچھی چیزیں نان وائلنس کے ساتھ وابستہ ہیں۔ متشددانہ سرگرمیاں (وائلنٹ ایکٹوزم) سماج میں نفرت کو جنم دیتی ہیں اور پر امن

سرگرمیاں محبت کو۔ وائلنس تخریب کا ذریعہ ہے اور نان وائلنس تعمیر کا ذریعہ۔ وائلنس کے ماحول میں دشمنی کو فروغ ملتا ہے اور نان وائلنس کے ماحول میں دوستی کو۔ وائلنس کا طریقہ منفی قدروں کو ابھارتا ہے اور نان وائلنس کا طریقہ مثبت قدروں کو۔ وائلنس کا طریقہ لوگوں کو مسائل میں الجھاتا ہے اور نان وائلنس کا طریقہ لوگوں کو مواقع کے استعمال کی طرف لے جاتا ہے۔ ایک لفظ میں، وائلنس اگر موت ہے تو نان وائلنس اس کے مقابلہ میں زندگی۔

قرآن اور حدیث میں جہاد کی بہت زیادہ فضیلت بیان ہوئی ہے۔ جہاد کیا ہے، جہاد کے معنی کوشش اور جدوجہد کے ہیں، یہ لفظ قتالی عمل کے مقابلہ میں غیر قتالی عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ اس کا ایک واضح ثبوت قرآن کی وہ آیت ہے جس میں کہا گیا ہے کہ منکرین کے ساتھ جہاد کرو، جہاد کبیر (الفرقان ۵۲)

قرآن کوئی تلوار یا گن نہیں۔ قرآن ایک نظریہ کی کتاب ہے۔ ایسی حالت میں قرآن کے ذریعہ جہاد کرو کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اوپر نظریاتی عمل کرو۔ اسلام کی برتر آئیڈیالوجی کے ذریعہ ان کے قلب وذہن کو مسخر کرو۔

اس قرآنی وضاحت کی روشنی میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ جہاد دراصل پیس فل ایکٹوزم یا نان وائلنٹ ایکٹوزم کا دوسرا نام ہے۔ قتال اگر وائلنٹ ایکٹوزم ہے تو جہاد نان وائلنٹ ایکٹوزم۔

پرامن آغاز

قرآن جب اترنا شروع ہوا تو اس میں پہلی آیت یہ اتری کہ اقرأ (العلق ۱) اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی عمل کا نقطۂ آغاز (starting point) کیا ہے۔ اسلامی عمل کا اسٹارٹنگ پائنٹ یہ ہے کہ اس مقام سے آغاز نہ کیا جائے جہاں متشددانہ

رد عمل کا اندیشہ ہو، بلکہ وہاں سے آغاز کیا جائے جہاں پر امن طور پر اپنی تحریک جاری رکھنے کی امید ہو۔

جس وقت قرآن میں اقرأ کا حکم آیا اس وقت اسلامی تحریک کے لئے آغاز کار کے اعتبار سے مکہ میں کئی option موجود تھے۔ مثلاً کعبہ میں رکھے ہوئے ۳۶۰ بتوں کو نکالنے سے آغاز۔ مگر ایسی صورت میں قریش کی طرف سے یقینی طور پر متشددانہ رد عمل پیش آتا۔

دارالندوۃ (مکہ کی پارلیمنٹ) میں سیٹ حاصل کرنے کی کوشش۔ عرب کے اطراف میں رومن ایمپائر اور ساسانی ایمپائر کا تسلط۔ لیکن اگر ان کے تسلط سے آزادی کو نقطۂ آغاز بنایا جاتا تو فوراً ہی سخت قسم کے جوابی تشدد کا سامنا پیش آتا۔

اس قسم کے مختلف option کو چھوڑ کر قرأت قرآن کا option لیا گیا جس کے بارے میں یقین تھا کہ وہ پر امن طور پر جاری رکھا جا سکتا ہے۔ اور اس کو کرنے کی صورت میں کوئی پر تشدد رد عمل بھی سامنے آنے والا نہیں۔

پیغمبر اسلام نے اپنی پوری زندگی میں اسی اصول کو اختیار فرمایا۔ آپ کی پالیسی گویا وائلنٹ متھڈ کے مقابلہ میں نان وائلنٹ متھڈ کو اختیار کرنے کی پالیسی تھی۔ یہی وہ چیز ہے جس کو آپ کی اہلیہ عائشہ صدیقہ نے اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا: رسول اللہ ﷺ کو جب بھی دو امر میں سے ایک امر کا انتخاب کرنا ہوتا تو آپ ہمیشہ مشکل کے مقابلہ میں آسان کا انتخاب فرماتے (ما خیر رسول اللہ ﷺ بین امرین الا اخذ ایسرھما) فتح الباری ٦/٤٥٦)

نان وائلنٹ ایکٹوزم کے فائدے

نان وائلنٹ ایکٹوزم کا ایڈوانٹج وائلنٹ ایکٹوزم پر کیا ہے۔ وہ مختصر طور

پر حسب ذیل ہے۔

ا۔ قرآن کے مطابق ہر انسان میں دو فیکلٹی ہے۔ ایک ایگو جس کو قرآن میں نفس امارہ کہا گیا ہے (یوسف ۵۳) اور دوسرا ضمیر جس کو قرآن میں نفس لوامہ کہا گیا ہے۔ (القیامہ ۲)

وائلنٹ متھڈ ہمیشہ یہ کرتا ہے کہ وہ لوگوں کے ایگو کو جگا دیتا ہے جس کا لازمی نتیجہ تباہی کی صورت میں نکلتا ہے۔ اس کے بر عکس نان وائلنٹ ایکٹوزم لوگوں کے ضمیر کو جگاتا ہے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے اندر خود احتسابی کا جذبہ (self introspection) پیدا ہوتا ہے۔ اور قرآن کے الفاظ میں اس کا یہ معجزانہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دشمن بھی قریبی دوست بن جاتا ہے (حٰم ۳۴)

۲۔ نان وائلنٹ متھڈ کا ایک عظیم فائدہ یہ ہے کہ آدمی کے وقت کا کوئی حصہ ضائع نہیں ہوتا۔ اس طرح اس کو یہ موقع مل جاتا ہے کہ وہ حالات کے اندر موجود مواقع کو آخری حد تک استعمال کر سکے۔ جیسا کہ حدیبیہ کے ناجنگ معاہدہ (no-war pact) کے بعد پیش آیا۔ اس معاہدۂ امن نے اس بات کو ممکن بنادیا کہ اہل اسلام کی طاقت مسلح ٹکراؤ میں ضائع ہونے کے بجائے پر امن تعمیری عمل میں استعمال ہو سکے (سیرۃ ابن کثیر ۳/۳۲۴)

۳۔ وائلنٹ ایکٹوزم میں ایک زبردست نقصان یہ ہے کہ اس کو چلانے کے لئے سماجی روایات کو توڑنا پڑتا ہے۔ اس کے بر عکس نان وائلنٹ ایکٹوزم میں یہ عظیم فائدہ ہے کہ اس کو سماجی روایات توڑے بغیر جاری کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ وائلنٹ ایکٹوزم کے ذریعہ آخری چیز جو حاصل کی جاتی ہے وہ موجود سسٹم کو

توڑنا ہے۔ ایک سسٹم کو توڑ کر دوسرے سسٹم کو لانا، یہ وائلنٹ متھڈ کے ذریعہ ممکن نہیں۔ اس کے برعکس نان وائلنٹ متھڈ چونکہ تدریجی طور پر عمل کرتا ہے اس لئے اس کے ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے کہ ایک نظام کو دوسرے نظام سے مبدل (replace) کیا جاسکے۔ یہی وجہ ہے کہ وائلنس کی بنیاد پر چلنے والی تحریکیں صرف ایک یا دوسری قسم کا حکومتی بدلاؤ (coupe) لانے پر ختم ہوجاتی ہیں۔ وہ چیز جس کو انقلاب (revolution) کہا جاتا ہے وہ صرف اس تحریک کے ذریعہ ممکن ہوسکتا ہے جس کو نان وائلنس کی بنیاد پر چلایا جائے۔

کامیابی نان وائلنٹ متھڈ کے ذریعہ

اسلام کے دور اول میں اور اس کے بعد اسلام کو جو بڑی کامیابیاں ہوئیں وہ سب نان وائلنٹ متھڈ کے ذریعہ حاصل ہوئیں۔ یہاں مثال کے طور پر چند کامیابیوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

۱۔ پیغمبر اسلام کے ابتدائی ۱۳ سالہ دور کو مکی دور کہا جاتا ہے۔ اس دور میں مکمل طور پر نان وائلنس یا پیسفزم کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ اس وقت مکہ میں متعدد ایسے اشو موجود تھے جو ٹکراؤ کا موضوع بن سکتے تھے۔ مگر پیغمبر اسلام نے ہر ایسے اشو سے اعراض کرتے ہوئے اپنے آپ کو پر امن تبلیغ کے دائرہ میں محدود رکھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس دور میں دعوہ ورک اپنی پوری طاقت کے ساتھ انجام دیا جاسکا۔ اسی ۱۳ سالہ دعوۃ ورک کے مختلف فائدوں میں سے ایک عظیم فائدہ یہ تھا کہ اسی دور میں وہ تمام بہترین افراد ملے جنھوں نے اسلام کی تاریخ بنائی۔ مثلاً ابو بکر، عمر، عثمان، علی، رضی اللہ عنہم وغیرہ

۲۔ مکہ میں جب وہاں کے سردار آپ کے خلاف جنگ پر آمادہ ہوگئے تو اس وقت بھی آپ نے جوابی انداز اختیار کرنے کے بجائے یہ کیا کہ خاموشی کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ چلے گئے۔

ہجرت اپنی نوعیت کے اعتبار سے بلاشبہ نان وائلنٹ ایکٹوزم کی ایک مثال ہے۔ اس پرامن تدبیر نے رسول اور آپ کے ساتھ ہجرت کرنے والے تقریباً دو سو اہل ایمان کو یہ موقع دیا کہ وہ مدینہ پہنچ کر وہاں اسلام کا ایک طاقتور سینٹر بنا سکیں۔ اگر وہ پرامن ہجرت کے بجائے مسلح مقابلہ کا طریقہ اختیار کرتے تو شاید اسلام کی تاریخ مکہ میں شروع ہو کر دوبارہ مکہ ہی میں دفن ہو جاتی۔

۳۔ ہجرت کے بعد آپ کے مخالفین نے یکطرفہ طور پر جنگ چھیڑ دی۔ اس کے نتیجہ میں بدر اور احد جیسے خونی واقعات پیش آئے۔ اس وقت آپ نے دوبارہ فریق مخالف کی شرطوں کو قبول کر کے دس سال کا معاہدۂ امن (peace treaty) کر لیا۔ جو اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس واقعہ کو قرآن میں فتح مبین کہا گیا ہے۔ (الفتح۔۱) یہی صلح ہے جس کے بعد وہ پرامن تعمیری عمل جاری ہو سکا جس نے آخرکار مکہ اور عرب کی تسخیر کو ممکن بنا دیا۔

۴۔ خلافت راشدہ کے آخر میں بنوہاشم اور بنوامیہ کے درمیان خونی ٹکراؤ پیش آیا۔ اس کے نتیجہ میں اسلام کا اقدام (advancement) دس سال کے لئے رک گیا۔ اس اقدام کو دوبارہ جس چیز نے کھولا وہ حسن بن علی (وفات ۵۰ھ) کی جنگ سے واپسی تھی جو بلاشبہ نان وائلنس ایکٹوزم ہی کی ایک عملی صورت ہے۔ حسن بن علی کے اس پرامن اقدام نے اسلام کے لئے ترقی کے دروازے دوبارہ کھول دیئے۔

۵۔ خلافت عباسیہ کے آخری زمانہ میں منگول قبائل نے مسلم دنیا پر حملہ کیا اور سمرقند سے لے کر حلب تک پورے علاقہ کو تباہ کر دیا۔ بظاہر اسلام کی تاریخ رکتی ہوئی نظر آنے لگی۔ اس وقت مسلمانوں میں پرامن دعوہ ورک ابھرا۔ اس کے نتیجہ میں یہ ہوا کہ

منگولوں کی بیشتر تعداد نے اسلام قبول کرلیااور وہ معجزاتی واقعہ پیش آیا جس کو ایک مستشرق نے ان الفاظ میں لکھا ہے۔۔۔۔۔ مسلمانوں کے مذہب نے وہاں فتح حاصل کرلی جہاں ان کے ہتھیار ناکام ہو چکے تھے:

The religion of Muslims has conquered where their arms had failed

۶۔اس نوعیت کا ایک عظیم واقعہ یہ ہے کہ خلافت راشدہ کے بعد حکومتی نظام میں بگاڑ آگیا۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی جو مسلسل جاری رہی۔ اس وقت بظاہر وہ تمام اسباب پیدا ہو گئے جو حکمرانوں سے ٹکراؤ کی دعوت دے رہے تھے۔ مگر پیغمبر کی ہدایت کے مطابق اہل اسلام نے مکمل طور پر سیاسی ٹکراؤ سے اعراض کیا۔ یہ تاریخ بنوامیہ کی خلافت سے شروع ہو کر صدیوں تک جاری رہی جب کہ تابعین، تبع تابعین، محدثین، فقہاء، علماء، صوفیاء، تمام اکابر امت نے تقریباً بلا استثنا اپنے آپ کو ٹکراؤ سے الگ رکھا۔

یہ کوئی سادہ بات نہ تھی۔ یہ دراصل وائلنٹ ایکٹوزم کے میدان سے ہٹ کر نان وائلنٹ ایکٹوزم کے میدان میں آنا تھا۔ چنانچہ یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ایک طرف مختلف ملکوں میں پرامن دعوہ ورک جاری ہوا۔ اور دوسری طرف اسی زمانہ میں قرآن، حدیث، فقہ، اور دوسرے اسلامی علوم بڑے پیمانہ پر مدون ہوئے۔ ہمارے کتب خانہ کی وہ تمام قیمتی کتابیں جن کو اسلام کا کلاسیکل لٹریچر کہا جاتا ہے وہ اسی پرامن عمل کے نتیجہ میں تیار ہوا۔

مثال کے طور پر حدیث کو اسلام میں قرآن کے بعد دوسرا شرعی ماخذ مانا جاتا ہے۔ یہ حدیثیں آج ہمارے پاس حدیث کی کتابوں میں مدون ہو کر مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ یہ اتنی زیادہ قیمتی ہیں کہ ان کے بغیر دین کا ڈھانچہ ہی نہیں بن سکتا۔ بنوامیہ اور بنو عباس کے زمانہ میں جب کہ حکمرانوں میں بگاڑ آیا اس وقت یہ تمام حدیثیں کہاں تھیں۔ یہ

تمام حدیثیں ان بزرگان امت کے سینہ میں تھیں جن کے نام آج حدیث کی کتابوں میں سلسلۂ سند کے طور پر لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ اگر یہ لوگ تشدد کے اصول کو اختیار کرتے ہوئے اپنے وقت کے "ظالم" حکمرانوں سے لڑ جاتے تو یہ حکمراں ان سب کو تہہ تیغ کر دیتے اور احادیث کا پورا ذخیرہ کتابوں میں مدون ہونے کے بجائے قبروں کے اندر دفن ہو جاتا۔

یہ صرف وائلنس کے مقابلہ میں نان وائلنس کو اختیار کرنے کا کرشمہ ہے کہ احادیث کا قیمتی ذخیرہ آج ہماری الماریوں میں چھپا ہوا مجلد صورت میں موجود ہے۔ اور ہم ہر لمحہ اس پوزیشن میں ہیں کہ ھدی محمدی سے کامل استفادہ کر سکیں۔

سیاسی خروج حرام

خلافت راشدہ کے بعد مسلم حکمرانوں میں واضح بگاڑ آنے کے باوجود علماء امت نے ان کے خلاف خروج (بغاوت) نہیں کیا۔ وہ ایک ہزار سال تک اس معاملہ سے بالکل بے تعلق رہتے ہوئے غیر سیاسی میدان میں اپنی کوششیں صرف کرتے رہے۔ یہ اتفاقاً نہیں تھا بلکہ واضح شرعی حکم کی بنیاد پر تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے، حدیث کی کتابوں میں کتاب الفتن یا دوسرے ابواب کے تحت تفصیلی روایات آئی ہیں۔ جن کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ نے صریح الفاظ میں یہ فرمایا کہ بعد کے زمانہ میں حکمرانوں کے اندر طرح طرح کا بگاڑ آئے گا۔ وہ ظلم اور بے انصافی کا معاملہ کریں گے۔ مگر تم لوگ ہرگز ان کے خلاف تلوار نہ اٹھانا بلکہ تم یہ کرنا کہ اپنے "اونٹ اور بکری" کو لے کر پہاڑوں کی طرف چلے جانا۔

"اونٹ اور بکری" سے مراد وہ مواقع کار ہیں جو حکمرانوں کے بگاڑ کے باوجود ان کے لئے غیر سیاسی میدان میں موجود تھے۔ آپ کی ہدایت کا مطلب یہ تھا کہ تم لوگ سیاسی میدان میں ٹکراؤ سے ہٹ کر غیر سیاسی میدان میں موجود مواقع کو پر امن طور پر استعمال

کرنا۔ پیغمبر اسلام کی یہ ہدایات اتنی واضح تھیں کہ علماء اسلام نے بعد کے زمانہ میں اس پر اجماع کرلیا کہ حکمرانوں کے خلاف بغاوت کرنا حرام ہے اور اس سے انھیں ہر حال میں اجتناب کرنا چاہیے۔

امام النووی نے صحیح مسلم کی شرح میں کتاب الامارۃ کے تحت احادیث کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔۔۔۔ تم لوگ حکمرانوں سے ان کے اقتدار کے معاملہ میں نزاع نہ کرو، اگر تم ان کے اندر صریح خلافِ اسلام بات دیکھو تب بھی تم صرف ناصحانہ قول کے ذریعہ ان پر حق واضح کرنے کی کوشش کرو۔ اور جہاں تک ان کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے بغاوت اور جنگ کا تعلق ہے تو وہ مسلمانوں کی اجماعی رائے کے مطابق حرام ہے۔ اگرچہ وہ فاسق اور ظالم ہی کیوں نہ ہوں :واما الخروج علیهم وقتالهم فحرام باجماع المسلین وان کانوا فسقة ظالمین (صحیح مسلم بشرح النووی ۲۲۹/۱۲)

پیغمبر اسلام کا یہ حکم، جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، نہایت اہم مصلحت پر مبنی تھا۔ اصل یہ ہے کہ دور اول میں (اور اس کے بعد بھی) سیاسی ادارہ کے باہر بے شمار علمی، دعوتی اور اصلاحی کام موجود تھے جن کو انجام دینا ضروری تھا۔ ان کی انجام دہی کے بغیر اسلام کی تاریخ ادھوری رہ جاتی۔ امت کے علماء اگر سیاسی ادارہ سے ٹکراؤ میں مصروف ہو جاتے تو یقینی طور پر یہ تمام تعمیری کام انجام پانے سے رہ جاتے۔ اس لئے پیغمبر اسلام نے صراحت اور تاکید کے ساتھ یہ حکم دیا کہ تم لوگ سیاسی ٹکراؤ سے اعراض کرو۔ یہ اعراض اس بات کی ضمانت تھا کہ سیاست کے علاوہ تعمیری شعبوں کا کام غیر منقطع طور پر جاری رہے گا۔

ہر سماج میں ہمیشہ دو متوازی مواقع موجود رہتے ہیں۔ ایک سیاسی ادارہ، اور دوسرا غیر سیاسی نظام جو مختلف غیر سیاسی اداروں کے ذریعہ قائم ہوتا ہے۔ اسلام کی اسکیم یہ ہے کہ

سماجی سطح پر قائم ہونے والے غیر سیاسی نظام کو ہمیشہ مستحکم رکھا جائے۔ اس طرح یہ کوشش کی جائے کہ سیاسی ادارہ کے بگاڑ یا تبدیلی کے باوجود غیر سیاسی نظام کی سطح پر اسلام مسلسل قائم رہے۔

جنگ کا حکم اسلام میں

قرآن کی بعض آیات میں جنگ (قتال) کا حکم دیا گیا ہے۔ (الحج ۳۹) اس سلسلہ میں قرآن کے مطالعہ سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

ا۔ پہلی بات یہ کہ جارحیت یا مسلح جنگ کا آغاز اہل اسلام کی طرف سے مطلقاً جائز نہیں۔ چنانچہ قرآن میں صراحۃً یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان لوگوں سے اللہ کے راستہ میں جنگ کرو جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور تم خود جارحیت نہ کرو (البقرہ ۱۹۰)

۲۔ اسلام میں صرف دفاعی جنگ جائز ہے۔ یعنی وہ جنگ جس میں جارحانہ آغاز دوسروں کی طرف سے کیا گیا ہو اور اہل اسلام بطور دفاع جنگی اقدام کریں۔ آغاز جنگ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں۔ یہی بات قرآن میں ان الفاظ میں آئی ہے کہ وہی ہیں جنھوں نے تم سے جنگ کا آغاز پہلی بار کیا ہے (وهم بدؤ كم اول مرة) التوبہ ۱۳

اس سلسلہ میں مزید یہ کہ فریق ثانی کی طرف سے جنگی اقدام ہو تب بھی اہل اسلام کی طرف سے فوراً دفاعی اقدام نہیں کیا جائے گا بلکہ ابتداءً جنگ سے اعراض کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی اور جب اعراض ناممکن ہو جائے تو اس وقت ناگزیر دفاع کے طور پر جنگ کی جائے گی۔ رسول اللہ کے تمام غزوات اسی اصول کی عملی مثال ہیں۔ جیسے کہ غزوۂ احزاب میں آپ نے لڑنے کے بجائے خندق کھود کر جنگ کو ٹال دینے کی کوشش کی اور حنین میں اس لئے جنگ کی کہ وہاں جنگ کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

۳۔ قرآن کے مطابق جنگ کی ایک قسم وہ ہے جو وقتی طور پر مطلوب تھی۔ یہ ہے

فتنہ کو ختم کرنے کے لئے جنگ(وقاتلوهم حتى لاتكون فتنه)البقرة۱۹۳

اس آیت میں فتنہ سے مراد جبری نظام ہے جو آخر کار مذہبی تعذیب (religious persecution) تک پہنچ جاتا ہے۔ قدیم زمانہ میں ساری دنیا میں جبر کا یہ سیاسی نظام قائم تھا۔ اس جبری نظام نے انسان کے اوپر روحانی اور مادی دونوں قسم کی ترقیوں کے دروازے بند کردئے تھے۔ اس وقت حکم ہوا کہ اس جبری نظام کو توڑ کر آزادی کا نظام لاؤ تاکہ انسان کے اوپر روحانی اور مادی ترقیات کے دروازے کھل سکیں۔

یہ کام پیغمبر اسلام کے زمانہ میں عرب کے اندر داخلی سطح پر انجام پایا۔ اس کے بعد خلافت راشدہ کے زمانہ میں ساسانی ایمپائر اور باز نطینی ایمپائر کو خدائی مدد سے توڑ دیا گیا۔ جس کے نتیجہ میں بین اقوامی سطح پر فکری جبر کا نظام ختم ہو کر فکری آزادی کا دور شروع ہوا۔

اس ذیل میں وہ روایت بے حد قابل لحاظ ہے جو صحیح بخاری میں آئی ہے۔ خلیفۂ چہارم علی بن ابی طالب کے بعد جب عبداللہ ابن زبیر اور بنو امیہ کے درمیان سیاسی جنگ شروع ہوئی تو عبداللہ بن عمر جو اس وقت سینئر موسٹ صحابی تھے وہ اس جنگ سے الگ رہے۔ لوگوں نے مذکورہ آیت کا حوالہ دے کر ان سے کہا کہ خدا نے قتال فتنہ کا حکم دیا ہے پھر آپ کیوں نہیں قتال کرتے۔ انھوں نے جواب دیا کہ فتنہ سے مراد تمہاری یہ سیاسی لڑائی نہیں ہے بلکہ اس سے مراد مذہبی جبر تھا اور اس کا خاتمہ ہم نے کردیا۔ (قد فعلنا) فتح الباری ۸/۱۶۰

اس سے معلوم ہوا کہ قتال فتنہ کی جنگ ایک وقتی اور محدود جنگ تھی جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں آخری طور پر مکمل ہو گئی۔ اب اس آیت کا نام لے کر جنگ کرنا درست نہیں۔ الا یہ کہ بالفرض وہی حالت دوبارہ پیدا ہو جائے جو آیت کے نزول کے وقت پائی جاتی تھی۔

پیغمبر اسلام کے سیرت نگار آپ کے غزوات کی تعداد ۸۰ سے زیادہ بتاتے ہیں۔ اس طرح کی چیزیں پڑھ کر ایک عام آدمی یہ تاثر قائم کرلیتا ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں گویا ہر سال تقریباً چار مرتبہ جنگ کی مگر یہ تاثر سراسر بے بنیاد ہے، اصل حقیقت یہ ہے کہ پیغمبر اسلام نے اپنی پوری پیغمبرانہ زندگی میں صرف تین بار باقاعدہ جنگ کی ہے۔ اس کے سوا جن واقعات کو "غزوہ" کہا جاتا ہے وہ دراصل جنگ سے اعراض کے واقعات ہیں نہ کہ جنگ میں ملوث ہونے کے واقعات۔

مثلاً سیرت کی کتابوں میں الاحزاب کے واقعہ کو غزوہ (جنگ) بتایا جاتا ہے۔ حالانکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اس موقع پر عرب کے مسلح قبائل ۱۲ ہزار کی تعداد میں جنگ کے ارادہ سے مدینہ کی سرحد پر پہنچے لیکن پیغمبر اور ان کے اصحاب نے خندق کھود کر اپنے اور ان کے درمیان ایک روک (buffer) قائم کر دیا اور اس طرح جنگ کی نوبت نہ آنے دی، یہی معاملہ دوسرے ان تمام واقعات کا ہے جن کو غزوہ کہا جاتا ہے۔ پیغمبر کے مخالفین نے بار بار آپ کو جنگ میں الجھانا چاہا مگر ہر بار آپ نے کوئی نہ کوئی تدبیر کر کے جنگ کو ٹال دیا یا جنگ کے بم کو ڈیفیوز کر دیا۔

صرف تین مواقع ایسے ہیں جب کہ آپ مسلح مقابلہ کے میدان میں داخل ہوئے ـــــ بدر، احد، حنین۔ مگر واقعات بتاتے ہیں کہ ان تینوں مواقع پر جنگ ناگزیر ہو چکی تھی۔ اس لئے آپ نے مجبورانہ دفاع کے طور پر جارحین کا مقابلہ کیا۔ مزید یہ کہ یہ تینوں جنگیں آدھے آدھے دن کے لئے تھیں۔ وہ دوپہر بعد شروع ہو کر غروب آفتاب تک ختم ہو گئیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہوگا کہ پیغمبر نے اپنی پوری زندگی میں عملاً صرف ڈیڑھ دن جنگ کی ہے۔ گویا پیغمبر کی ۲۳ سالہ عمر نبوت میں آپ ڈیڑھ دن کو چھوڑ کر پوری مدت تک

نان وائلنس کے اصول پر قائم رہے۔

قرآن میں پیغمبر اور آپ کے اصحاب کو قتال کا حکم دیتے ہوئے یہ کہا گیا ہے کہ اس معاملہ میں فریق ثانی نے ہی پہلے آغاز کیا ہے (التوبہ ۱۳) یہ آیت اس معاملہ میں قول فیصل کی حیثیت رکھتی ہے کہ اسلام میں جنگ صرف دفاعی ہے۔ خود سے اپنی طرف سے جارحیت کر کے جنگ چھیڑنا اہل اسلام کے لئے جائز نہیں۔ اسلام کا طریقہ کار مکمل طور پر نان وائلنس کے اصول پر قائم ہے۔ ناگزیر دفاع کے سوا کسی بھی حالت میں اسلام وائلنس کی اجازت نہیں دیتا۔

دور حاضر اور نان وائلنس

موجودہ زمانہ میں اسلام کا سب سے بڑا مسئلہ میرے نزدیک یہ ہے کہ نان وائلنس کی سنت کو مسلمانوں نے تقریباً بھلا دیا۔ موجودہ زمانہ میں جب ترکی خلافت اور مغل سلطنت کا خاتمہ ہوا اور فلسطین جیسے مسائل پیش آئے تو ساری دنیا کے مسلمان اتنے بڑے پیمانہ پر منفی رد عمل کا شکار ہوئے کہ کسی کو یاد نہیں رہا کہ اسلام کی پالیسی نان وائلنس کی پالیسی ہے نہ کہ وائلنس کی پالیسی۔ اسلام سے اسی انحراف کا نتیجہ تھا کہ سو سال سے زیادہ مدت تک خونی جنگ کے باوجود مسلمان کوئی بھی مثبت نتیجہ حاصل نہ کر سکے۔ اس کے بجائے یہ ہوا کہ جو کچھ انھیں اس کے بعد بھی حاصل تھا اس کو بھی انہوں نے ناقابل بیان حد تک کھو دیا۔

امام مالک کا قول ہے کہ اس امت کے آخر کی اصلاح بھی اسی طریقہ سے ہوگی جس طریقہ سے امت کے اول کی اصلاح ہوئی تھی۔ (لن یصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها) اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہا جائے تو یہ کہنا درست ہوگا کہ پہلے زمانہ کے مسلمانوں کے معاملات نان وائلنٹ متھڈ کے ذریعہ درست ہوئے تھے اسی طرح موجودہ

زمانہ کے مسلمانوں کے حالات بھی نان وائلنٹ متھڈ کے ذریعہ درست ہوں گے۔ وائلنٹ متھڈ کے ذریعہ نہ پہلے کوئی فائدہ مل سکتا تھا اور نہ آج اس کے ذریعہ کوئی فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کے حالات حدیبیہ کے حالات کے مشابہ ہیں۔ آج دوبارہ یہ واقعہ پیش آیا ہے کہ فریق ثانی بہت بڑے پیانہ پر اس روش کا مظاہرہ کر رہا ہے جس کو قرآن میں حمیت جاھلیہ کہا گیا ہے (الفتح ۲۶) دور اول میں اس کا حل یہ تھا کہ مسلمان رد عمل کا شکار ہو کر خود حمیت جاہلیہ کا مظاہرہ نہ کریں بلکہ وہ کلمۂ تقوی کو پکڑ لیں۔ اسی طرح انھیں خدا کی مدد حاصل ہو گی اور وہ فتح مبین کے مستحق بن جائیں گے (الفتح ۲۶)

حدیبیہ کے معاہدہ کے وقت عرب میں یہ حالات تھے کہ قریش جن کو عرب کی لیڈر شپ حاصل تھی وہ لڑائی پر تلے ہوئے تھے۔ انھوں نے حرم پر قبضہ کر رکھا تھا۔ انھوں نے پیغمبر اور آپ کے ساتھیوں کو ان کے وطن سے نکال دیا تھا۔ انھوں نے مکہ کے مسلمانوں کے گھروں اور جائدادوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ مسلسل اسلام کے خلاف منفی پروپیگنڈا کر رہے تھے۔

ان حالات میں اہل اسلام کے سامنے دو انتخاب (آپشن) تھے۔ ایک یہ کہ وہ ظلم کو ختم کرنے اور اپنے حقوق کو حاصل کرنے کے نام پر فریق ثانی سے جنگ چھیڑ دیں۔ جس کا نتیجہ یقینی طور پر خود اہل اسلام کے لئے مزید جانی اور مالی نقصان کی صورت میں ظاہر ہوتا۔ دوسرا آپشن یہ تھا کہ وہ بروقت ہونے والے سیاسی یا مادی نقصان پر صبر کر لیں اور اس نقصان کے باوجود اب بھی جو امکانات عملی طور پر ان کے لئے موجود ہیں ان کو استعمال کریں۔ پیغمبر اسلام اور آپ کے ساتھیوں نے اس دوسرے آپشن کو لیا۔ اس کا شاندار نتیجہ یہ نکلا کہ صرف چند سال کے اندر پورے ملک کی تاریخ بدل گئی۔

دور حاضر کے لئے پیغمبرانہ رہنمائی

پیغمبر اسلام ﷺ کو قرآن میں سارے عالم کے لئے رحمت بتایا گیا ہے (الانبیاء ۱۰۷) یہ کوئی پر اسرار بات نہیں، یہ ایک فطری حقیقت ہے جس کو علمی اور عقلی مطالعہ کے ذریعہ سمجھا جا سکتا ہے۔

انسان جب پیدا ہوتا ہے تو وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جو حیران کن حد تک وسیع اور پیچیدہ ہے۔ انسان اس دنیا سے کس طرح اپنا تعلق قائم کرے اور اپنے فکر کی تشکیل کس طرح کرے، یہ سب کچھ اس کے لئے ایک نامعلوم بات ہوتی ہے۔ وہ نہ پیدائش کے ساتھ کوئی گائیڈ بک اپنے ساتھ لے کر آتا ہے اور نہ کسی پہاڑ کے اوپر ایسا کوئی بورڈ دکھائی دیتا ہے جس میں اس کے لئے ضروری ہدایات لکھی ہوئی موجود ہوں۔

اس بنا پر ایسا ہوتا ہے کہ انسان لمبی مدت تک اندھیرے میں بھٹکتا رہتا ہے اور بہت مشکل سے کبھی علم کا کوئی سرا اس کے ہاتھ آتا ہے اور کبھی وہ اس سے بھی محروم رہتا ہے۔

اس کی ایک مثال فلسفہ اور سائنس کا مسئلہ ہے، فلسفہ کیا ہے۔ فلسفہ کائنات کے اسرار کو علمی طور پر دریافت کرنے کی ایک کوشش ہے۔ انسان اپنے اندر پیدائشی طور پر تجسس کا مزاج رکھتا ہے۔ وہ چیزوں کی حقیقت کو جاننا چاہتا ہے۔ اس بنا پر فلسفہ اپنی ابتدائی صورت میں اسی وقت سے موجود تھا جب کہ انسان اس دنیا میں آباد ہوا۔ تاہم زیادہ واضح اور منظم صورت میں فلسفہ کی شروعات پانچ ہزار سال پہلے یونان میں ہوئی۔ اس کے بعد دنیا کے مختلف علمی مراکز میں فلسفیانہ غور و فکر کا سلسلہ باقاعدہ صورت میں جاری ہو گیا۔

لیکن پانچ ہزار سال کی مسلسل کوشش کے باوجود فلسفہ کوئی بامعنی چیز انسان کو نہ

دے سکا۔ اس مدت میں بے شمار بڑے بڑے دماغوں کی کاوش صرف انتشار ذہنی پر ختم ہوتی رہی۔ اس کے مقابلہ میں سائنس نے انسان کو صرف دو سو سال کے اندر اتنی زیادہ چیزیں دی ہیں جن کا شمار بھی سخت مشکل ہے۔ یہ صرف سائنس ہے جس نے انسان کو اس دور تک پہنچایا جس کو جدید تمدنی دور کہا جاتا ہے۔

دونوں میں یہ فرق کیوں ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سائنس نے علم کی محدودیت کو جانا اور اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے اس کو استعمال کیا۔ جب کہ فلسفہ ہزاروں سال تک اس محدودیت سے بے خبر تھا۔ قدیم زمانہ میں فلسفہ اور سائنس کے دائرے ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہوئے تھے۔ دونوں یکساں طور پر انسانی علم کا جزء سمجھے جارہے تھے۔ قدیم فلاسفہ علم کے سارے ہی پہلوؤں کو اپنے دائرہ کی چیز سمجھتے تھے اور ان پر مجموعی غور وفکر کرتے تھے۔

مگر تین سو سال پہلے مطالعاتی تقسیم کا ایک واقعہ عمل میں آیا۔ فلسفہ اور سائنس کے موضوعات کو ایک دوسرے سے جدا کر دیا گیا۔ اب معنوی حقائق پر غور وفکر فلسفہ کا موضوع بنا۔ اور موضوعی حقیقتیں سائنس کے مطالعہ کی چیز قرار پائیں۔ اب پھول کی کیمسٹری سائنس کا موضوع بن گئی اور پھول کی معنویت فلسفہ کا موضوع۔

علم کی یہ حد بندی یا دوسرے لفظوں میں، انسانی محدودیت کا یہ اعتراف غیر معمولی نتائج کے ظہور کا سبب بنا۔ قدیم زمانہ میں انسان قابل دریافت اور ناقابل دریافت کے درمیان تفریق کئے بغیر یکساں طور پر ذہنی کاوش میں مصروف رہتا تھا جو عملاً ایک بے نتیجہ کوشش کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ مگر جب اس نے ناقابل دریافت کو الگ کر کے قابل دریافت پر محنت شروع کی تو اس کی کوشش اس کو غیر معمولی نتائج تک پہنچانے کا سبب بن گئی۔

یہ ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دنیا میں علمی حدود کو جاننا کتنا زیادہ ضروری ہے۔ اس دنیا میں کوششوں کا نتیجہ خیز ہونا اس پر منحصر ہے کہ آدمی کو علم کے حدود معلوم ہوں۔ وہ کوئی عمل شروع کرتے ہوئے صحیح نقطہ آغاز کو جانتا ہو۔ اس کو واضح طور پر یہ معلوم ہو کہ ایک بات اور دوسری بات میں کیا فرق ہے۔ ان چیزوں کی صحیح معرفت آدمی کے عمل کو نتیجہ خیز بناتی ہے اور جب ان چیزوں کے بارے میں صحیح معرفت حاصل نہ ہو تو بڑی سے بڑی کوشش بھی بے نتیجہ ہو کر رہ جائے گی۔

اس مثال سے یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ خدا کے پیغمبر کی رہنمائی انسان کے لئے کتنا زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ خدا جو کائنات کا خالق ہونے کی بنا پر اس کے تمام اسرار و رموز سے آخری حد تک واقف ہے وہ انسانوں میں سے ایک شخص کو چنتا ہے اور پھر اس کو وہ تمام بنیادی علوم دیتا ہے جو انسان کے لئے اس کی تعمیر کی راہ میں ضروری ہیں۔ یہ پیغمبر گویا خدائی گائیڈ ہے جس کی رہنمائی اس بات کو ممکن بناتی ہے کہ انسان معرفت کی پوری روشنی میں اپنے سفر حیات کا آغاز کرے اور دونوں دنیاؤں کی سعادت حاصل کر سکے۔

پیغمبر کے ذریعہ انسان کو کئی چیزیں ملتی ہیں۔ ان ملنے والی چیزوں میں سب سے پہلی چیز یقین ہے۔ یہ صرف خدا کے پیغمبر کی رہنمائی ہے جو آدمی کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ اپنی زندگی کا آغاز یقین و اعتماد کے ساتھ کر سکے۔

انسان کو بہر حال ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جس سے وہ اپنے فکر و عمل کے لئے رہنمائی حاصل کرے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام فلسفہ کا آتا ہے۔ مگر فلسفہ خود ہی اس بات کا معترف ہے کہ ابھی وہ آخری حقیقت تک نہیں پہنچا، وہ ابھی تلاش کے مرحلہ میں ہے۔ ایسی حالت میں فلسفہ آدمی کو تذبذب تو دے سکتا ہے مگر اس کے لئے یقین کا

سرمایہ مہیا نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد وہ علم ہے جس کو سائنس کہا جاتا ہے۔ مگر سائنس بھی خود اپنے اعتراف کے مطابق، یہ خدمت انجام نہیں دے سکتی۔ اس کا واضح سبب یہ ہے کہ سائنس بھی پیشگی طور پر یہ اعلان کر رہی ہے کہ اس نے کائناتی علم کے صرف جزئی یا ظاہری حصہ کو اپنے مطالعہ کا موضوع بنایا ہے، بحیثیت مجموعی پورے کائناتی علم کی دریافت اس کے مطالعہ کا موضوع نہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسی سائنس انسانوں کو وہ ذہنی اور فکری سرمایہ نہیں دے سکتی جس کو یقین کہا جاتا ہے۔

۱۹ویں صدی میں سوشلزم کا تصور ابھرا جس نے بالآخر کارل مارکس (وفات ۱۸۸۳) کے نظریہ کی صورت میں ایک مکمل فلسفہ حیات کا درجہ حاصل کر لیا۔ ۱۹۱۷ میں اس کے حامیوں نے اس نظریہ کی بنیاد پر روس میں ایک باقاعدہ حکومت قائم کر لی جو بعد کو سوویت یونین کی صورت میں ایک عظیم ایمپائر بن گئی۔ اس نظریہ کو اتنا زیادہ فروغ ہوا کہ دنیا کے بیشتر اذہان اس سے متاثر ہو گئے۔ اس کا سحر لوگوں کے ذہن سے صرف اس وقت ختم ہوا جب کہ خود سوویت یونین ۱۹۹۱ میں ٹوٹ کر بکھر گیا۔

میں خدا کے فضل سے سوویت یونین کے سقوط (۱۹۹۱) سے تقریباً ۳۵ سال پہلے اس موضوع پر اپنے تفصیلی مطالعہ کے ذریعہ اس حقیقت تک پہنچ چکا تھا کہ مارکسزم سراسر ایک بے حقیقت چیز ہے۔ اسی وقت میں نے اس موضوع پر ایک کتاب لکھی تھی جو پہلی بار اپریل ۱۹۵۹ء میں مکتبہ جماعت اسلامی رام پور سے شائع ہوئی اس کتاب کا نام یہ تھا:

مارکسزم تاریخ جس کو رد کر چکی ہے

۱۹ویں صدی کے نصف ثانی اور بیسویں صدی کے نصف اول تک پورے سو سال

اس طرح گذرے ہیں جب کہ ساری دنیا پر مارکسی سوشلزم ایک غالب فکر کی حیثیت سے چھایا ہوا تھا۔ یہاں تک کہ امریکی مفکر گال بریتھ کو یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ مارکس کو موجودہ زمانہ میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ تاریخ کے تمام انسانوں سے زیادہ تھی حتی کہ محمدؐ سے بھی زیادہ۔

مگر آج ہر شخص جانتا ہے کہ مارکسزم کا یہ افسانہ ختم ہو گیا۔ اب دنیا میں شاید دو آدمی بھی ایسے موجود نہیں جو مارکس سے وہ فکری غذا لیں جو ان کے لئے یقین واعتماد کے ہم معنی بن سکے۔

اس کے بعد مذاہب کا نمبر آتا ہے مذہب کیا ہے۔ مذہب اپنی حقیقت کے اعتبار سے اس علم کا نام ہے جو براہ راست خدا کی طرف سے آیا ہو۔ قرآن میں علم کی دو تقسیم کی گئی ہے، ایک تجرباتی علم اور دوسرے الہامی علم۔ قرآن کی مندرجہ ذیل آیت میں یہی بات کہی گئی ہے۔

ایتونی بکتٰب من قبل ھذا أو أثرة من علم ان کنتم صادقین۔(الاحقاف ٤)

میرے پاس اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ۔ یا کوئی علم جو چلا آتا ہو، اگر تم سچے ہو۔

اصولی طور پر یہ بات درست ہے کہ مذہب سچائی کا ماخذ ہے اور انسان کو یقین کی نعمت دے سکتا ہے۔ مگر یہاں ایک تاریخی حقیقت انسان اور (باستثنا اسلام) مذہب کے درمیان حائل ہو گئی ہے۔ وہ یہ کہ موجودہ مذاہب میں سے کوئی بھی مذہب تاریخی طور پر معتبر نہیں۔ اس وقت دنیا میں ایک درجن بڑے مذاہب ہیں (چھوٹے مذاہب ان کے علاوہ ہیں) مگر ان مذاہب کا حال یہ ہے کہ ان کے بارے میں وہ تاریخی شواہد موجود نہیں جو ان کو

قابل اعتبار درجہ دے سکیں۔

مزید یہ کہ ان مذاہب کے پاس خدائی الہام کے طور پر جو کتابیں موجود ہیں وہ ثابت شدہ طور پر محرف ہو چکی ہیں۔ ان میں سے ہر کتاب میں طرح طرح کی متضاد باتیں اکٹھا ہیں اور خالص علمی طور پر یہ جاننا مشکل ہے کہ ان میں کون سی بات الہامی ہے اور کون سی بات وہ ہے جو انسانوں نے اس کے اندر داخل کر دی ہے۔

مذاہب کے ان اختلافات میں جب حقیقت گم ہو گئی تو اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو اپنے آخری رسول کے طور پر بھیجا تا کہ وہ اختلافات کو ختم کر کے واحد سچی بات انسان کو بتا دیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

ومآانزلنا عليك الكتاب الاّ لتبين لهم الذى اختلفوا فيه وهدى ورحمة لقوم يؤمنون. (النحل ٦٤)

اور ہم نے تم پر کتاب (قرآن) صرف اس لئے اتاری ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر سنا دو جس میں وہ اختلاف کر رہے ہیں اور وہ ہدایت و رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کو جو خدائی کتاب دی گئی وہ پوری طرح ایک محفوظ کتاب ہے۔ اس طرح وہ انسان کو یہ موقع دے رہی ہے کہ وہ اس کتاب کو خدائی ہدایت کے ایک معتبر ماخذ کے طور پر پکڑے اور اس سے یقین کا وہ سرمایہ حاصل کرے جو موجودہ دنیا میں تعمیر حیات کے لئے ضروری ہے۔

انسانی سماج کی صحت مند تعمیر کے لئے ایک بہت ضروری بات یہ ہے کہ انسان یہ جانے کہ عورت اور مرد کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں جب

آزادی کا دور آیا تو اس معاملہ میں اپنے آزادانہ غور و فکر کے تحت انسان نے یہ رائے قائم کی کہ عورت اور مرد دونوں ہر اعتبار سے بالکل یکساں ہیں۔ دونوں کو سماجی سرگرمیوں میں بلا تفریق برابر کا موقع ملنا چاہیئے، اسی اصول پر وہ پورا معاشرہ قائم ہے جس کو جدید معاشرہ کہا جاتا ہے۔

مگر عورت اور مرد کی مساوات کے اس نظریہ نے تمام سماجی شعبوں کو غیر متوازن بنادیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں غیر معمولی تمدنی ترقیوں کے باوجود انسان کو امن اور سکون حاصل نہیں۔ اس کا سب سے بڑا سبب بلا شبہ یہی ہے کہ مرد و زن کی مطلق مساوات کے جدید نظریہ نے تمام انسانی تعلقات کو غیر متوازن بنادیا (تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو راقم الحروف کی کتاب خاتون اسلام)

اس معاملہ میں انسان اگر پیغمبر اسلام کی رہنمائی کو اختیار کرتا تو کبھی انسانی سماج عدم توازن کا شکار نہ ہوتا۔ پیغمبر اسلام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے جو حقیقتیں انسان پر کھولی ہیں ان میں سے ایک، فطرت کا قانون ہے۔ اس کے مطابق عورت اور مرد کی تخلیق اس طرح کی گئی ہے کہ دونوں میں سے ہر ایک کو ایک ایسی چیز دی گئی ہے جو دوسرے کو حاصل نہیں۔ اس طرح دونوں مل کر ایک مجموعہ بناتے ہیں۔ دونوں میں سے کوئی بھی پورے معنی میں مکمل نہیں مگر جب دونوں باہم مل جائیں تو ان کے ملنے سے ایک کامل مجموعہ وجود میں آتا ہے۔

یہی وہ حقیقت ہے جو قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے: (آل عمران ۱۹۵) یعنی تم ایک دوسرے کا جزء ہو (بعضکم من بعض) یہی بات حدیث میں تمثیل کی زبان میں اس طرح بتائی گئی ہے۔

انما النساء شقائق الرجال (سنن ابی داؤد. ۱/ ۶۰)

عورتیں مرد کا نصف حصہ ہیں۔

پیغمبر کے ذریعہ جو باتیں انسان کے علم میں آئی ہیں ان میں سے ایک چیز وہ ہے جس کو خدا کی اسکیم آف تھنگس (scheme of things) کہا جا سکتا ہے۔ یعنی موجودہ دنیا یا انسانی زندگی کے بارے میں خالق کا طے کیا ہوا نقشہ۔ یہ زندگی کے مسئلہ کو حقیقی طور پر سمجھنے کے لئے بے حد ضروری ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہوں وہ کبھی بھی زندگی کا کامیاب نقشہ نہیں بنا سکتے۔ مثلاً موجودہ زمانہ میں جو مفکرین پیدا ہوئے ان کا ایک مشترک مسئلہ یہ ہے کہ ہر ایک نے بطور خود ایک آئیڈیل بنایا اور اس کے مطابق سماجی نقشہ کی تشکیل شروع کردی۔ مگر چونکہ ان کا آئیڈیل غیر فطری تھا اس لئے وہ انسانیت کو کوئی مثبت چیز نہ دے سکے، مثلاً انسانوں میں نابرابری کا مسئلہ جو بیشتر مفکرین کا فکری موضوع رہا ہے۔ ہر ایک اس کوشش میں تھا کہ کوئی ایسا سماجی نقشہ بنائے جس میں سب کو برابر کا درجہ حاصل ہو سکے۔

فطرت کے معیار پر جانچئے تو اس نظریہ میں ایک بنیادی خامی ملے گی۔ انسانوں میں معاشی اور سماجی اعتبار سے فرق کا حقیقی سبب وہ چیز نہیں ہے جس کو استحصال (exploitation) کہا جاتا ہے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کچھ ظالم لوگوں نے سازش کر کے سماج میں مختلف درجات قائم کر دیئے ہیں۔ اس کا اصل سبب یہ ہے کہ لوگ خلقی طور پر فرق کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی زیادہ ذہین ہے اور کوئی کم ذہین، کوئی زیادہ طاقتور ہے اور کوئی کم طاقتور، کسی کو جدوجہد کا پورا موقع ملتا ہے اور کوئی درمیان ہی میں کسی حادثہ یا موت کا شکار ہو جاتا ہے، کوئی موافق حالات میں پیدا ہوتا ہے اور کوئی ناموافق حالات میں۔

یہی فطری فرق لوگوں کے درجات میں فرق پیدا کرتا ہے۔ اس فرق کا سرا ان خارجی اسباب(external factors) کے ہاتھ میں ہے جہاں تک انسان کی رسائی نہیں۔ پھر کون ہے جو اس فرق کو مٹا سکے۔

اشتراکی مفکرین کی سوچ یہ ہے کہ تمام ذرائع پیداوار کو حکومت کے قبضہ میں دے دیا جائے اور حکومت طاقت کو استعمال کر کے سب کے درمیان برابری قائم کر دے۔ مگر جب اشتراکی نظام میں اس کی کوشش کی گئی تو معلوم ہوا کہ اس مصنوعی کوشش میں ایک اور زیادہ بڑی چیز قتل ہو گئی ہے، اور وہ ہے محرک عمل۔ اشتراکی نظام میں کوئی شخص مالک نہ رہا بلکہ تمام لوگوں کی حیثیت تنخواہ دار سرکاری ملازم جیسی ہو گئی۔ اس کے نتیجہ میں وہی چیز حذف ہو گئی جو ترقیاتی عمل کا سب سے بڑا محرک ہے۔ یعنی ذاتی انٹریسٹ۔ یہی وجہ ہے کہ اشتراکی سماج میں ترقیاتی عمل خطرناک حد تک رک گیا۔ یہاں تک کہ وہ کمزور ہو کر ڈھ پڑا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانوں کے درمیان فرق کوئی برائی نہیں ہے، وہ ایک عظیم نعمت ہے۔ دراصل یہی فرق ہے جس کی بنا پر ایک آزاد انسانی سماج میں مسلسل طور پر ایک کو دوسرے سے چیلنج اور مقابلہ پیش آتا رہتا ہے۔ یہ چیلنج اور مقابلہ لوگوں کو دائمی طور پر متحرک رکھتا ہے۔ جس سماج سے فرق وتفاوت کو ختم کر دیا جائے وہاں چیلنج بھی ختم ہو جائے گا۔ اور جہاں چیلنج نہ رہے وہاں بقیہ تمام چیزیں اپنے آپ غیر موجود ہو جائیں گی۔

اسی طرح ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ موجودہ دنیا کے خالق نے اس کو آزمائش کی مصلحت کے تحت بنایا ہے۔ مفکرین عام طور پر اس مصلحت کو نظر انداز کر کے زندگی کا نقشہ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر وہ ابھی تک اس کا فکری نقشہ بھی نہ بنا سکے، عملی نظام کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔

مثلاً یہ تمام مفکرین شدت سے ایک چیز کا ذکر کرتے ہیں اور وہ ہے برائی کا مسئلہ (problem of evil)۔ حتی کہ ان کا یہ کہنا ہے کہ ہماری دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ انسانی سماج میں اسی برائی کی موجودگی ہے۔ اس لئے ہمیں سب سے زیادہ اس پر توجہ دینا چاہیئے۔

مگر یہ ایک غیر حقیقت پسندانہ سوچ ہے۔ یہ مفکرین جس چیز کو برائی کا مسئلہ کہتے ہیں وہ دراصل مصلحت امتحان کا مسئلہ ہے۔ یہ دنیا چونکہ امتحان کے مقصد کے تحت بنائی گئی ہے اس لئے یہاں لازمی طور پر وہ واقعات پیش آئیں گے جن کو غلط تعبیر کی بنا پر برائی کا مسئلہ کہا جاتا ہے۔

مثلاً انسانوں کا خالق ان کو صبر اور شکر کی میزان پر جانچنا چاہتا ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ کبھی انسان کے اوپر مشکل حالات گذریں تاکہ یہ دیکھا جائے کہ اس نے صبر کیا یا نہیں۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو آسانیاں ملیں تاکہ یہ دیکھا جائے کہ وہ شکر کا رسپانس دیتا ہے یا سرکشی کا رسپانس۔ اسی طرح اس مصلحت کا تقاضا ہے کہ کچھ لوگوں کے پاس کم مال ہو اور کچھ لوگوں کے پاس زیادہ، تاکہ یہ دیکھا جائے کہ کم مال والا حسد کا شکار ہوا یا نہیں۔ اسی طرح زیادہ مال والے نے اپنے مال کو صرف ذاتی عیش پر خرچ کیا یا اس نے اس میں سے انسانیت کا حصہ ادا کیا وغیرہ۔

جدید دور کے انسان نے آزادی کو خیر مطلق کا درجہ دیا ہے۔ یہ دراصل قدیم زمانہ کے بادشاہی نظام اور اس کے تحت قائم شدہ جبر کے ردِ عمل کا نتیجہ ہے۔ آزادی بلاشبہ انسانی ترقی کے لئے انتہائی قیمتی ہے۔ مگر بلا قید آزادی برعکس طور پر تباہی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ بلا قید آزادی کے سوسالہ تجربہ کے بعد خود مغرب میں ایسے مفکرین پیدا ہو رہے ہیں

جو کہہ رہے ہیں کہ آزادی کو خیر مطلق کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ مثال کے طور پر۔ بی۔ ایف اسکنر (B F Skinner) کی کتاب جس کا خلاصہ خود مصنف کے لفظوں میں یہ ہے کہ۔۔۔ ہم آزادی کا تحمل نہیں کر سکتے:

we can't afford freedom

پیغمبر اسلام کے ذریعہ جدید انسان کو یہ معرفت دی جا رہی ہے کہ وہ کس طرح صحت مند آزادی اور غیر صحت مند آزادی میں فرق کرے۔ آپؐ کے ذریعہ انسان کو اس حد بندی کا حقیقی علم ہوتا ہے کہ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام۔ اسی طرح پیغمبر اسلام کے ذریعہ جدید انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کس طرح عورت اور مرد کو یکساں احترام دیتے ہوئے دونوں کے ورک پلیس کی قابل عمل تقسیم کرے۔ زندگی کے تمام معاملات کو درست طور پر منظم کرنے کے لئے حدود کا علم بہت ضروری ہے اور صحیح اور فطری حدود کا یہ علم انسان کو صرف پیغمبر کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔

جدید انسان کے لئے یہی پیغمبر کی سب سے بڑی دین ہے۔ پیغمبر کی تعلیمات انسان کو یہ موقع دیتی ہیں کہ وہ ان کی رہنمائی میں اپنی زندگی کا نقشہ زیادہ بہتر طور پر منظم کر سکے۔